# فہرست مضمون نگارانِ معارف

## جلد ۹۲

## جولائی ۱۹۶۳ء تا دسمبر ۱۹۶۳ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

# فہرست مضامین معارف

جلد ٩٢

(بہ ترتیب حروف تہجی)

# فہرست مضامین معارف

جلد ۹۲

(بہ ترتیب حروف تہجی)

---

جلد ۹۲ - ماہ صفر ۱۳۸۳ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۶۳ء - عدد ۱

## مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# شذرات

اردو زبان کا مسئلہ کسی خاص فرقہ یا طبقہ کا نہیں بلکہ حق و انصاف، جمہوریت و سیکولرزم اور حکومت اور ملک کی بہی خواہی کا ہے، اس لیے جب تک اس کا حق نہیں ملتا اس مسئلہ کو چھوڑا نہیں جاسکتا اور حکومت سنے یا نہ سنے اردو کی آواز برابر اس کے کانوں تک پہنچاتے رہنا ضروری ہے۔ ہندی اب حکومت کی زبان بن چکی، اس کی اس حیثیت سے کسی کو بھی انکار نہیں اور اردو کے حق کے مطالبہ کا مقصد ہندی کی مخالفت نہیں ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اب اردو کا کوئی حق باقی نہیں رہا اور اس کے ساتھ جو زیادتی بھی کیجائے اس کو خاموشی کے ساتھ برداشت کیا جائے۔

---

اردو کی حیثیت محض ایک معمولی زبان کی نہیں ہے، وہ اپنی عمومیت، مقبولیت، لسانی، علمی، ادبی اور تمدنی اہمیت ہر لحاظ سے ہندوستان کی تمام زبانوں میں امتیازی حیثیت رکھتی ہے، اس کو جو خصوصیتیں حاصل ہیں وہ ہندی کو بھی حاصل نہیں ہیں، اور ابھی ان کو حاصل کرنے کے لیے ایک مدت درکار ہے، وہ ہندی سے سب سے زیادہ قریب ہے، بلکہ اسی کی ایک شاخ کی مہذب اور ترقی یافتہ شکل ہے، وہ ہندوستان کے مشترک تمدن کی ترجمان ہے، اس میں تقریباً تمام ہندوستانی زبانوں کے کچھ نہ کچھ اثرات پائے جاتے ہیں، اس لیے پورے ملک میں سمجھی جاتی ہے، اور اسکے مختلف حصوں میں ربط و تعلق کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، اور جس قومی اتحاد و یکجہتی کی ضرورت کا احساس اب ہوا ہے اس کو وہ مدتوں سے پورا کرتی چلی آرہی ہے، ہندوستان کی جنگ آزادی میں اس کا سب سے زیادہ حصہ ہے، حصول آزادی کے متعلق جیسی پرجوش اور ولولہ انگیز نظمیں اردو میں ہیں ہندوستان کی کسی زبان میں نہیں مل سکتیں، سیاسی پروپگنڈے کو چھوڑ کر اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو اس صوبے میں اردو یا کم سے کم ہندوستانی بولنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے، اور اسکے مغربی اضلاع، اور شہری اور تعلیم یافتہ طبقہ کی زبان تو خالص اردو ہے، حتی کہ اردو کے مخالفین بھی سیاسی پلیٹ فارم سے اتر کر اپنی روزانہ کی زندگی میں آج بھی اردو ہی بولتے ہیں، علمی و تمدنی ذخیرے میں ہندوستان کی کوئی زبان اسکا مقابلہ نہیں کرسکتی، غرض جس پہلو سے بھی دیکھا جائے اردو ہندوستان کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ زبان ہے، اسلیے اسکو مٹانا حق و انصاف، جمہوریت، سیکولرزم، علم و فن، تعلیم و تہذیب سب کا خون کرنا ہے۔

---

سہ لسانی فارمولے کا سب سے بڑا مقصد قومی اتحاد و یکجہتی ہے جس کا ایک بڑا ذریعہ اردو ہے، مگر ہمارے صوبہ کی حکومت نے اس بارہ میں جو پالیسی اختیار کی ہے اور جس طرح اردو کی جگہ سنسکرت کو دلانا چاہتی ہے وہ اس مقصد کے سراسر خلاف ہے، جن لوگوں کا مقصد محض اردو کو مٹانا ہے ان کیلئے تو دلائل بیکار ہیں، لیکن جو لوگ انصاف پسند اور ملک کے بہی خواہ ہیں ان کو اس مسئلہ کے دوسرے پہلوؤں پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے، اس میں شبہ نہیں کہ اردو ہندو مسلمانوں کی مشترک زبان ہے، جسے انصاف پسند ہندو بھی انکار نہیں کرتے، یہ اور بات ہے کہ مسلمانوں کو اردو سے ایک خاص خصوصیت اور جذباتی لگاؤ بھی ہے، لیکن اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اردو تنہا مسلمانوں کی زبان ہے تو کیا ہندوستان کے پانچ کروڑ اور اس صوبے کے ایک کروڑ مسلمانوں کی زبان کو زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔

---

زبان کا مسئلہ مذہب سے کم اہم نہیں ہے، اس کو دبانے سے انقلاب انگیز تحریکیں اٹھ کھڑی ہوتی ہیں، جنوبی ہند والوں کی مثال اسکی شاہد ہے، حالانکہ حکومت نے وہاں کی کسی زبان کو دبایا نہیں، محض ہندی کے تسلط کے خوف سے وہ ہندوستان سے علحدگی تک کے لیے آمادہ ہیں، اور حکومت کو ان کے مطالبات کے سامنے جھکنا پڑا، یہ اسکا ثبوت ہے کہ اردو کی حق تلفی محض مسلمانوں کی بے بسی کا نتیجہ ہے، اگر ان میں بھی دم ہوتا تو حکومت اس طرح اردو کا حق پامال نہیں کرسکتی تھی، لیکن اقلیت کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا جمہوریت اور سیکولرزم کے سراسر خلاف ہے، دوسرے اس سے مسلمانوں میں جو بددلی اور بے اعتمادی پیدا ہوتی ہے وہ ملک کے لیے قطعاً مفید نہیں، اور اسکی ذمہ داری تمامتر حکومت کے سر ہے۔

---

گپتا حکومت سے خوش فہموں کو بڑی امیدیں تھیں، انھوں نے اپنی خوش آیند باتوں اور لسانی کمیٹی کے ذریعہ

اردو والوں کو بہلانے کی بھی کوشش کی، مگر جب ایک آل انڈیا تعلیمی فارمولے کی رو سے اس صوبے میں اردو کی تعلیم کی گنجایش نکلی تو اسکی جگہ سنسکرت کو ٹھونس کر اردو کی تعلیم کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا، ایک پنڈت جواہر لال نہرو اپنی حق پسندی سے اردو کے جائز حقوق کی حمایت برابر کرتے رہتے ہیں، سہ لسانی فارمولا کی وضاحت میں اردو کے حق میں فیصلہ دیا، لیکن یہ اردو کی بدقسمتی ہے کہ پنڈت جی کی آواز بھی جس کی صدائے بازگشت سے پورا ہندوستان گونج اٹھتا ہے، اردو کے معاملہ میں بے اثر رہتی ہے۔

---

سنسکرت کے احیاء اور اسکی تعلیم و اشاعت کے لیے تو حکومت کے سارے ذرائع وقف ہیں اور مختلف شکلوں میں اسکی تعلیم کا انتظام ہے، اسلیے اگر سہ لسانی فارمولے میں تیسری زبان کی جگہ اردو کو دیدی جاتی تو اس سے سنسکرت کا کیا بگڑ جاتا، اس سے ظاہر ہے کہ حکومت کا مقصد محض سنسکرت تعلیم نہیں بلکہ اردو کو مٹانا ہے، تاہم اس صورت حال سے مایوس نہ ہونا چاہئے اور اردو کے لیے کوشش برابر جاری رکھنا چاہیے، اردو والوں کے بہلانے کے لیے ایک شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بعض اسکولوں میں اردو لینے کی اجازت دیدی جائے، مگر اس پر ہرگز قناعت نہ کرنا چاہیے اور جب تک ہر اسکول میں یہ حق نہیں ملتا اس کی جد و جہد برابر جاری رکھنا چاہیے۔

---

افسوس ہے کہ گذشتہ اختر مئی میں ڈاکٹر سید ہادی حسن صاحب سابق صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی نے انتقال کیا، مرحوم یونیورسٹی کے لائق اور ممتاز اساتذہ میں تھے، قدیم و جدید فارسی زبان و ادب پر انکو استادانہ عبور حاصل تھا، انکی فارسی دانی کو اہل زبان تک مانتے تھے، نہایت شستہ و رفتہ فارسی میں برجستہ تقریر کرتے تھے، اور اپنی ساحرانہ خطابت سے سماں باندھ دیتے تھے، اور اس حیثیت سے وہ یونیورسٹی کی آبرو تھے، یونیورسٹی سے انکو والہانہ تعلق تھا، اس کے علمی کاموں میں سرگرمی سے حصہ لیتے تھے، اور انکی ذات سے یونیورسٹی کو بڑے فوائد پہنچے، میڈیکل کالج کے جنکی فراہمی میں ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم کے بعد انکی کوششوں کو سب سے زیادہ دخل تھا، انکی شخصیت بڑی دلآویز تھی، فارسی شعر و ادب اور شعراء کے تذکرے اور تراجم پر انگریزی میں متعدد تصانیف انکی یادگار ہیں، اس زمانہ کے فارسی کے اساتذہ میں انکی جیسی قابلیت کی مثالیں کم ملیں گی، اللہ تعالیٰ انکی مغفرت فرمائے۔

---

ع ۹۲ ش ۱



# مقالات

## طب میں مسلمانوں کے اکتشافات و اجتہادات

### تاریخ طب کی روشنی میں


از جناب پروفیسر سید علی احمد صاحب نیر واسطی لاہور


تاریخ علوم و فنون اور بالخصوص تاریخ طب میں مسلمانوں کے دور کی کڑی کو یہ کہکر درمیان سے غائب کر دیا گیا ہے کہ اس دور میں فن کی ترقی اور اکتشافات کے سلسلے میں کوئی کام نہیں ہوا، اگر ہوا ہے تو صرف اس قدر کہ عربوں نے اپنے عہد میں یونانی علم و حکمت کی روایات کو باقی رکھا اور بعد میں یورپ کے حوالے کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس رائے کو قبول کر لینے کے بعد ایک طالب العلم کے ذہن میں اسلاف کے علم و فن کی تاریخ کے سلسلے میں صرف یہی تصور قائم ہو سکتا ہے کہ طب کی تدوین میں مسلمانوں کا [illegible] کوئی حصہ نہیں، اور اس لیے ان کے دور کی طب کا مطالعہ بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

یعنی تاریخ طب کے تین اہم ادوار میں سے جن کا تعلق اولاً یونان، دوسرے اسلامی ممالک اور تیسرے مغربی ملکوں سے ہے۔ پہلے اور تیسرے دور کے درمیانی عہد کو جو درحقیقت مسلمانوں کے علم و فن کی زریں تاریخ اور عربوں کے علمی و فنی درخشاں کارناموں کا زمانہ ہے، اور پہلے اور دوسرے دور کے درمیان اہم سلسلۃ العقد کی حیثیت رکھتا ہے، علوم و فنون میں تخلیقی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے بڑی حد تک ناقابل اعتنا قرار دے کر یکسر نگاہوں سے اوجھل کر دیا گیا اور عصر حاضر

کی تقریباً تمام تر ابتدائی معلومات کا سرا براہ راست یونان سے ملا دیا گیا ہے۔

اس حقیقت کے اعتراف میں قطعاً کوئی باک نہیں کہ مسلم مفکرین اور حکماء نے بلاشبہ یونانی علوم وفنون سے استفادہ کیا لیکن انھوں نے اس راہ میں کورانہ تقلید اختیار نہیں کی، اور نہ اس مختصر سے سرمایۂ فن پر قناعت کی جو بقراط و جالینوس نے ان کے لیے چھوڑا تھا، بلکہ انھوں نے یونانیوں کے ترکہ کی پوری طرح چھان بین کی، جو چیز مفید پائی اسے قبول کیا اور جو غلط سمجھی اسے بلا دریغ رد کر دیا، اور پھر اس میں نئی معلومات کا اسقدر اضافہ کیا کہ قدیم طب یکسر ایک نئی چیز اور اس کی چھوٹی سی نہر علم کا بحر ناپیدا کنار بن گئی، بو علی سینا کا قانون اور ابوبکر محمد بن زکریا رازی کی حاوی جیسی ضخیم کتابیں اس حقیقت پر شاہد عدل ہیں۔

عربوں نے اپنی فکری اور اجتہادی قوتوں سے قدیم فن طب میں جو بے شمار اضافے، اکتشافات اور اجتہادات کیے ہیں ان کی تفصیل کے لیے ایک ضخیم کتاب درکار ہے۔ اس مضمون میں مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر بعض کی جانب مختصراً اشارہ کیا جاتا ہے۔

ع توخود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

**علم تشریح (اناٹومی)** عربوں نے یونانیوں کے علم تشریح اور جالینوس کی کتاب التشریح کو بلا چون وچرا اور بلا تحقیق قبول نہیں کیا بلکہ قدیم علم تشریح کی پوری طرح چھان بین کی، یوحنا بن ماسویہ نے کتاب التشریح لکھی تو اس نے اس سلسلے میں تشریحی مقاصد کے لیے خلیفہ معتصم باللہ سے بندر منگوائے اور ان کے ایک ایک عضو کو کاٹ کر تشریحی معلومات کی تصدیق اور تحقیق کی۔ کہا جاتا ہے کہ یوحنا اس مقصد کے لیے اپنے بیٹے کی زندگی کو ختم کرنا چاہتا تھا کہ خلیفہ اس کی راہ میں آڑے آگیا اور اس نے بندر بھجوا دیے۔

منصور بن محمد نے ۱۳۹۶ء میں جو تشریح منصوری لکھی اور اس میں اعضاء کے جو نقشے اور ان کی جو قلمی تصویریں پیش کی ہیں، یونانیوں کے لٹریچر میں ان کی کوئی مثال موجود نہیں۔

عربوں نے یونانیوں کی معلومات پر اضافے ہی نہیں کیے بلکہ جابجا اصلاح بھی کی ہے، عبداللطیف بغدادی



(گیارہویں صدی عیسوی میں) لکھتا ہے کہ جالینوس کی یہ غلطی ہے کہ وہ فکِ اسفل کو ایک سے زیادہ ہڈیوں سے مرکب سمجھتا ہے اور مسلم مشرحین ہی نے بیان کیا کہ کھوپڑی سات ہڈیوں سے نہیں (جیسا کہ جالینوس نے سمجھا ہے) بلکہ آٹھ سے مرکب ہے۔

علی بن عباس نے بیان کیا کہ عروق میں تین نسیں پائی جاتی ہیں اور مسلم مشرحین ہی نے بتایا کہ کان میں تین چھوٹی ہڈیاں (عظام صغیرہ) موجود ہیں جن کے ذریعہ سماعت کا فعل انجام پاتا ہے۔

**علم وظائف اعضاء (فزیالوجی)** برہان الدین نے شرح اسباب میں بیان کیا ہے کہ خون میں شکر (اسکراجنب) موجود ہے، محمد بن زکریا رازی نے بیان کیا کہ معدہ میں ترش مادہ پایا جاتا ہے، اور حنین نے بتایا کہ معدہ میں ایک ترش مادہ پایا گیا ہے جو بھوک کا احساس پیدا کرتا ہے۔

علاء الدین ابو العلاء علی بن ابی الحزم القرشی الدمشقی نے سر ولیم ہاروے سے تین سو سال پہلے مسئلہ دورانِ خون کو پوری وضاحت سے بیان کیا، ڈاکٹر جے بلاتھم کو جو مانچسٹر یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں، اس حقیقت کا پوری طرح اعتراف ہے۔

حنین بن اسحٰق نے بیان کیا کہ اعصاب کی ساخت، دماغ کی ساخت کے مشابہ ہے، علاء الدین القرشی نے بیان کیا کہ غذا جسمانی حرارت کے لیے ایندھن کی حیثیت رکھتی ہے، بعد میں اس نظریہ کو مزید ترقی دی گئی،

ابو سہل مسیحی نے واضح کیا کہ انجذاب غذا کا فعل معدہ کی بجائے آنتوں میں زیادہ ہوتا ہے، اور بو علی سینا نے بیان کیا کہ فعل انہضام درحقیقت منہ ہی سے شروع ہو جاتا ہے جب کہ اس میں منہ کی رطوبتیں شامل ہو جاتی ہیں،

ابو الفرج نے بیان کیا کہ اعصاب میں ایسی نالیاں موجود ہیں جن کے ذریعہ حس اور حرکت کی تحریکات راہ پاتی ہیں۔

علم الجراثیم (بیکٹریالوجی) | عصرِ حاضر کی طب آج تمام تر جراثیم کی تحقیق کی رہینِ منت ہے، اس باب میں بو علی سینا کی تحقیقات اولیت کا حق رکھتی ہیں، جو وضاحت کے ساتھ یہ بیان کرتا ہے کہ تعدی (چھوت) کے لیے یہ ضروری ہے کہ جسم کی رطوبت خارجی ارضی مادہ سے متاثر ہو، اور ہسپانیہ کا عرب طبیب ابن خاتمہ ۱۳۴۹ء میں بیان کرتا ہے کہ انسان باریک ترین اجسام سے گھرا ہوا ہے، جو جسم میں داخل ہو کر بیماری پیدا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر گرونر کی رائے ہے کہ یہ بیان قطعی طور پر اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ عرب اطباء جراثیم کے نظریہ سے باخبر تھے،

ابن الخطیب نے بڑی وضاحت کے ساتھ تعدی (چھوت چھات) کی حقیقت بیان کی ہے اور کہا ہے کہ یہ امر تجربہ اور مشاہدے سے ثابت ہے۔

علم تشخیص و علاج | جرجانی نے ذخیرۂ خوارزم شاہی میں ڈاکٹر پیری سے چھ سو سال پہلے غوطرا (گھٹر) اور جحوظ العین) کا تعلق بیان کر دیا تھا، جبکہ پیری نے اس کے بہت بعد ۱۸۲۵ء میں اس کا اکتشاف کیا،

رازی نے چیچک اور خسرہ پر پہلی مرتبہ ایک کتاب کتاب الجدری والحصبہ لکھی اور اس میں چیچک اور خسرہ کا فرق واضح کیا، یونانی حکماء دونوں کو ایک ہی چیز سمجھے تھے۔

ابو المنصور صاعد بن بشر بن عبدوس نے تمام حکمائے یونان کے قدیم طریق علاج کے خلاف اکثر امراض باردہ مثلاً فالج، لقوہ اور استرخاء کے لیے ادویہ باردہ اور ترکِ غذا کا علاج رائج کیا،

ابو الحسن نے جو عضد الدولہ کا طبیب تھا، دماغی جریانِ خون کے لیے جو غالباً ضغطِ دموی کا نتیجہ ہوتا ہے، فصد تجویز کیا، ابو القاسم الزہراوی نے دسویں صدی عیسوی میں بیان کیا کہ موخر الدماغ یا حرام مغز کی چوٹ فالج زیریں کا سبب ہوتی ہے،

عرب اطباء نے پہلی مرتبہ انبوب معدی (سٹامک ٹیوب) کا استعمال کیا جس کے ذریعہ معدہ سے زہر کا اخراج کیا جاتا تھا،



عرب اطباء علاج العضو بالعضو سے پوری طرح واقف تھے، پچاس سال ہوئے اس طریق علاج کی دریافت کا سہرا ڈاکٹر براؤن سیکوارڈ کے سر باندھا گیا ہے، حالانکہ صدیوں پہلے عرب اطباء میں یہ طریق علاج رائج تھا، چنانچہ وہ حیوان کے دماغ کو دماغ کی قوت کے لیے اور خصیتین کو خصیتین کی قوت کے لیے استعمال کرتے تھے، حیوٰۃ الحیوان میں اس کی مکمل تصریحات موجود ہیں،

ابن وافد نے علاج بالغذا پر زور دیا ہے، اور رضی الدین نے کثرت استعمال غذا کو ضعف و لاغری کا مفید طریق علاج قرار دیا

بہاء الدین نے ۱۵۰۰ء میں پہلی مرتبہ ہے فیور کو معلوم کیا جبکہ یورپ والوں پر صدیوں کے بعد اس کی حقیقت واضح ہوئی۔

علی بن ربن نے عرق النساء (سیاٹیکا) کو عصبی بیماری سمجھا اور اس مرض میں عصب پر کئی تجویز کی،

ابو الحسن الطبری پہلا شخص ہے جس نے مرض دق کو انفلٹریشن (رشح) بتایا، اور بیان کیا کہ یہ مرض پھیپھڑوں کے علاوہ دیگر اعضاء میں بھی ہوتا ہے،

نجیب الدین سمرقندی ڈاکٹر رچرڈ برائٹ سے جس سے اٹھارہویں صدی عیسوی میں برائٹس ڈزیز کو منسوب کیا گیا، صدیوں پہلے اس مرض کو معلوم کر چکا تھا، اس نے وضاحت سے بیان کیا تھا کہ اس مرض میں پیشاب میں رطوبت بیضیہ (البیومن) خارج ہوتی ہے اور جسم اس طرح پھول جاتا ہے کہ اگر اس کو دبایا جائے تو کچھ دیر کے لیے گڑھا پڑ جاتا ہے،

بو علی سینا کا استاد ابو المنصور الحسن القمری اپنی کتاب غنیٰ منیٰ میں صدیوں پہلے سوزاک بلکہ لحم زائد کا بھی اکتشاف کر چکا تھا جسے سٹرکچر کہا جاتا ہے۔

ابو الحسن الطبری پہلا طبیب ہے جس نے سارکوپٹیس (قراد الجرب) سے متعارف کرایا،

علم الجراحت (سرجری) | علم الجراحت (سرجری) میں مسلمانوں نے بڑے قابل قدر اکتشافات کیے ہیں۔

ابو القاسم الزہراوی نے بہت سے آلاتِ جراحت ایجاد کیے ہیں جن کی تصاویر اس کی کتاب التصریف

میں موجود ہیں،

ابن زہر نے اپنی کتاب التیسیر میں گیارہویں صدی عیسوی میں قصبۃ الریہ کے آپریشن کو بیان کیا جبکہ یونانی حکماء نے اس سے پہلے اپنی تصانیف میں اس آپریشن کا کوئی ذکر نہیں کیا،

بو علی بن سینا نے پہلی مرتبہ غرب (لیکری مل فسچولا) کا علاج بیان کیا ہے، اور اس کے لیے پروب (مجرات) سے متعارف کرایا ہے،

مسلمانوں نے پہلی مرتبہ جریانِ خون کو روکنے کے لیے مقام ماؤف کو سردی پہنچانے کا طریقہ رائج کیا، زخموں پر کٹی کا استعمال اور زخموں کو ریشم کے دھاگے سے سینا شروع کیا،

انہی نے پہلی مرتبہ جراحت کے سلسلے میں عمومی بے حسی اور بیہوشی کو رواج دیا، حتی کہ بعض بڑے آپریشنوں میں مریضوں کو سات سات دن تک بیہوش رکھتے تھے،

آنکھوں کی سرجری میں خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کا بہت بڑا حصہ ہے، وہ تقریباً وہ تمام آپریشن کرتے تھے جو آج کیے جاتے ہیں،

مسلمان حکماء جانتے تھے کہ نزول الماء (کٹریکٹ) رطوبت جلدیہ کے غلیظ ہونے کا نام ہے،

مسلمان حکماء نے طب میں پہلی مرتبہ ضعفِ بصارت کی مختلف اقسام کے لیے عینکوں کو رائج کیا شارح اسباب نے نزول الماء کے باب میں اس کا واضح الفاظ میں تذکرہ کیا ہے۔

بو علی بن سینا نے سرطان کے آپریشن کے سلسلہ میں پہلی بار وضاحت سے یہ بیان کیا کہ آپریشن کے وقت سرطان کے قریب کے تمام متعلقہ حصوں کو جڑ سے خارج کر دیا جائے۔

سر کے اعضاء سے متعلق آپریشنوں میں مسلمان سرجنوں نے پہلی مرتبہ یو ودلا (لہاۃ) اور نیزل پالی پس (بواسیر الانف) کے آپریشن کو بیان کیا، ٹانسلز (لوزتین) کے نکالنے اور ڈرم آف دی ایر (طبل الاذن) سے پالی پس (ذبل الاذن) کا طریقہ ایجاد کیا، زبان کے سرطان میں زبان کو جڑ سے کاٹ دینے کا



طریقہ بیان کیا اور جمجمہ کے آسٹیو مائی لائٹس (التہاب مخ العظام) کی صورت میں ماؤف ہڈی کو نکال کر اس کی جگہ کتے کی کھوپڑی کی ہڈی جوڑ دینے کا طریقہ وضع کیا،

مسلمان سرجنوں نے پیٹ کے آپریشن کیے، اور باریطون کے پھوڑے کی صورت میں باریطون سے مواد نکالنے کے لیے ٹروکار (آلۂ بازل) اور کینولا (قصبۃ البزل) داخل کرنے کا طریقہ رائج کیا، جسے بعد میں نول اور پوٹین نے اختیار کیا، بہاء الدین نے اس طریقہ کار کو وضاحت سے بیان کیا ہے،

فن الولادت | فن الولادت (مڈوائفری) کے سلسلے میں یونانیوں کا کوئی واضح ریکارڈ اس وقت ہمارے پاس موجود نہیں ہے، فن طب کی اس شاخ کے بانی درحقیقت عرب ہی ہیں،

ابو القاسم الزہراوی پہلا شخص ہے جس نے اپنی کتاب التصریف میں واجز ریوزیشن کو بیان کیا ہے،

ابو القاسم الزہراوی نے مردہ بچے کے پیٹ سے اخراج کے لیے کرینیو کلاسٹی (تکسیر جمجمۃ الجنین) کا طریقہ بیان کیا ہے اور خود اس پر عمل کیا ہے،

ایڈنبرا یونیورسٹی کی لائبریری میں آثار الباقیہ کے نام سے جو کتاب موجود ہے اس میں ایک عرب طبیب کو سیزیرین آپریشن (عملیہ قیصریہ) کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے،

ادویہ اور معالجات | ادویہ اور معالجات کے سلسلے میں عربوں نے جو اضافے کیے ہیں وہ بہت زیادہ ہیں،

جرجی زیدان نے اپنی کتاب تاریخ التمدن الاسلامی کی تیسری جلد میں "الذی احدثہ المسلمون فی الطب" کے عنوان سے ایک باب باندھا ہے، اور اس میں وہ لکھتے ہیں کہ:

"عربوں نے پہلی مرتبہ علاج بالجراحۃ میں ادویات کا استعمال شروع کیا، مسلولین کے ناخنوں کی کیفیت کو بیان کیا، یرقان اور ہوائے اصفر کا علاج ذکر کیا، جنون کے لیے افیون کو بمقدار کثیر استعمال کرایا، نزف الدم کے لیے سرد پانی ڈالنا تجویز کیا، خلع کتف اور نزول الماء کے آپریشن کا طریقہ بتایا، اور تفتیت حصاۃ کا طریق ذکر کیا، نیز انھوں نے ان

بعض نوع طب پر کتابیں لکھیں جن کا ذکر کتب متقدمین میں نہ تھا، مثلاً یوحنا بن ماسویہ نے
جذام پر، رازی نے چیچک اور خسرہ پر، ابو موسیٰ عیسیٰ نے بواسیر پر اور قسطا بن لوقا نے
مرگ ناگہانی پر کتابیں لکھیں۔"

رازی پہلا شخص ہے جس نے ٹائیفائڈ میں مریض کے سر کو سرد کرنا اور اس پر پانی سے بھیگی ہوئی گدی رکھنا، اور بو علی بن سینا نے مریض کے لیے بستر آبی کا استعمال تجویز کیا جس نے بعد میں ترقی کرکے لیٹرز ٹیوبز اور گولڈ بیٹنگ اور آئس بیگز کی صورت اختیار کر لی۔

جہاں تک علم الادویہ کا تعلق ہے، عربوں نے اس کی بھی نہایت شاندار خدمت کی ہے، انھوں نے ریوند، کافور اور سنا کے خواص معلوم کیے، طب میں بنج کا استعمال شروع کیا، شکر بنائی اور شہد کی جگہ اس کا استعمال رائج کیا، بہت سی ہندوستانی ادویہ کو طب میں شامل کیا، اور بیشمار ایسی نئی جڑی بوٹیاں معلوم کیں جن سے اطبائے یونان یکسر ناواقف تھے، رازی نے مرہم سیماب بنایا، ابن الموفق کی کتاب الابنیہ عن حقائق الادویہ جو پہلی مرتبہ یونانی جڑی بوٹیوں پر فارسی زبان میں لکھی گئی تھی، صرف ۵۰۰ جڑی بوٹیوں کے ذکر پر مشتمل تھی، اس کے بعد ابن البیطار نے جب اس موضوع پر کتاب المفردات لکھی تو اس میں ان کی تعداد ۱۴ سو سے اوپر پہنچ گئی،

فن دواسازی کو عربوں نے معراج کمال پر پہنچا دیا تھا، وہ ہر قسم کے شربات اور معجون بناتے تھے، اور اطریفل کا استعمال تو درحقیقت انہی نے شروع کیا، گولیوں پر سونے چاندی کے ورق چڑھانا بھی عربوں ہی کی ایجاد ہے۔

عربوں نے طب میں پہلی مرتبہ قرابادین (فارماکوپیا) کو رواج دیا، چنانچہ سابور ابن سہل پہلا طبیب ہے جس نے طب میں قرابادین کی ابتدا کی، یونانیوں میں قرابادین (فارماکوپیا) کا کوئی رواج نہ تھا،

فن کیمیا جس پر آج تمام معالجہ کا دارومدار ہے، خاص طور پر عربوں کا رہین منت ہے اور ایسا معلوم



ہوتا ہے کہ اس فن کی بنیاد ہی عربوں نے رکھی ہے، انھوں نے علم کیمیا میں ترشیح و تصعید و تقطیر تبلور اور تدویب کے طریقے پہلی مرتبہ بیان کیے اور بیشمار کیمیاوی اشیا، مثلاً نائٹرک ایسڈ، سلفیورک ایسڈ، نائٹرو ہائیڈرو کلورک ایسڈ، لائکر امونیا، مرکری کلورائڈ، مرکری آکسائڈ، پوٹاشیم نائٹریٹ، فیرس سلفاس وغیرہ اشیا بنائیں، ان کے علاوہ بہت سے اقسام کے کھار اور تیزابات تیار کیے،

اس سلسلے میں ایک قابل ذکر امر یہ ہے کہ عربوں نے کیمیائے جدید کی تاسیس ہی نہیں کی بلکہ علم کیمیائے قدیم کے خلاف کتابیں بھی لکھیں اور اس کی ابتدا یعقوب بن اسحٰق کندی نے کی،

علم الادویہ میں عربوں کے ذوق تحقیق و تجسس کا اندازہ دیسقوریدوس کی کتاب "الادویہ" پر تحقیق اور ریسرچ کے کام سے کیا جا سکتا ہے، کہا جاتا ہے کہ پہلی مرتبہ اس کتاب کا ترجمہ المتوکل کے زمانے میں اصطفن بن بسیل نے کیا، جس پر حنین بن اسحٰق نے نظرثانی کی مگر بہت سی یونانی دواؤں کے متبادل نام نہ معلوم ہو سکے، پھر جب الناصر کے زمانے میں یہ نسخہ بغداد سے ہسپانیہ پہنچا تو دوبارہ اس کتاب پر توجہ کی گئی اور اس کی تصحیح کے لیے شہنشاہ روم کے کتب خانے سے اس کا ایک اور نسخہ منگوایا گیا، جو قدیم یونانی زبان میں تھا، مگر اسپین میں اس وقت یونانی زبان کا جاننے والا کوئی نہ تھا، اس لیے شہنشاہ روم سے درخواست کی گئی کہ وہ یونانی زبان کے کسی ماہر کو بھیجے، اس لیے روم سے قدیم یونانی زبان کا ماہر نقولا ہسپانیہ پہنچا، اس نے عرب حکماء کے تعاون سے اس کتاب کے ترجمے کا کام مکمل کرایا، پھر بھی دس دوائیں ایسی رہ گئیں جن کے متبادل عربی نام معلوم نہ ہو سکے

**نظام طب اور نظریات** طب میں عربوں کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے فن طب کے تمام منتشر مضامین اور مباحث کو ایک نظام کے ماتحت جمع کرکے باقاعدہ صورت میں مرتب کیا جس پر فردوس الحکمۃ، کامل الصناعۃ، قانون اور حاوی جیسی اہم کتابیں گواہ ہیں، جن کی مثالیں یونانیوں کے ذخیرۂ تصانیف میں نہیں مل سکتیں،

عرب حکماء نے اپنے ذہن و فکر سے ہزاروں نئے نظریات وضع کیے اور قدیم نظریات پر رد و قدح کی۔ کہا جاتا ہے کہ عرب حکماء یونانیوں کی تقلید میں ارکان، امزجہ اور اخلاط کی اربعیت کے قائل رہے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک ارکان، اخلاط، امزجہ وغیرہ کا تعلق ہے ان کو تسلیم کرنے کے باوجود کئی عرب حکماء کے نزدیک ان کی اربعیت زیر بحث ہے، اور شیخ نے تو صاف کہہ دیا ہے کہ یہ طب نہیں، طبیعیات کے مسائل ہیں، اور ایک طبیب ان کے رد و قبول میں بالکل آزاد ہے۔

عرب اطبا اس نظریہ کے قائل تھے کہ ہر شخص کا ایک جداگانہ مزاج ہے، جس کے مطابق وہ اثرات قبول کرتا ہے۔ ابو علی بن سینا نے اس نظریہ کی وضاحت کی ہے۔ عصر حاضر میں حساسیت یعنی الرجی کے مسئلے کی بنیاد درحقیقت یہی نظریہ ہے۔

عرب اطبا مریض کا علاج کرتے وقت مریض کی قوت مدافعت کو پیش نظر رکھتے تھے، اور ان کی رائے تھی کہ اصل معالج طبیعت مدبرۂ بدن ہے، طبیب کا کام اس کو قوت دینا ہے۔ ابن زہر اندلسی نے اس نظریہ کی پوری طرح توضیح کی ہے۔

**ترجمہ و تصنیف**

کہا جاتا ہے کہ عربوں کا سب سے اہم کارنامہ یونانی زبان کی کتابوں کے ترجمہ کا کام ہے، جو اموی اور ابتدائی عباسی دور میں عربوں کے ہاتھوں انجام کو پہنچا، لیکن ہماری رائے میں اس سے کہیں زیادہ اہم ان کی وہ ذاتی تصنیفات ہیں جن سے آج روم، پیرس، انگلستان اور ترکی کے کتب خانے بھرے پڑے ہیں۔

عربوں نے عباسیوں کے عہد اول ہی میں جبکہ بغداد میں حنین کے زیر نگرانی یونانی زبان کی کتابوں کے ترجمے کا کام ہو رہا تھا، اپنی ذاتی تصنیفات کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، اور اس کام میں زیادہ تر وہ لوگ شامل تھے جو جندی شاپور کے اسکول سے تعلق رکھتے تھے۔ ان مصنفین میں سے سابور بن سہل اور عیسیٰ بن ماسہ کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، عیسیٰ بن ماسہ کی ایک آزاد تصنیف



کا نام "کتاب من لا یحضرہ طبیب" ہے، اور ابن ماسویہ کی کتاب کا نام "کتاب الحمیات" ہے، اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس کو مشجر اور جداول کی صورت میں پیش کیا گیا تھا۔

اس کے بعد طب عربی میں آزاد اور ذاتی تصانیف کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا اور علی بن عباس مجوسی، ابو علی بن سینا اور زکریا رازی جیسی عظیم شخصیتیں پیدا ہوئیں جن کی تصانیف سے تمام دنیا کے کتب خانے معمور ہیں۔ ان میں صرف رازی کی حاوی ہی اتنی ضخیم کتاب ہے جس کی کوئی مثال نہیں پیش کی جا سکتی۔

**حریت فکر اور عملی نظام تعلیم**

طب میں عربوں کی بڑی خصوصیت ان کی حریت فکر اور ان کا عملی نظام تعلیم ہے، جس کی مثال قدما میں نہیں ملتی۔ یوحنا بن ماسویہ نے کتاب "النوادر الطبیہ" میں واضح الفاظ میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ ہم اسی وقت تک قدما کے کسی حکم کے پابند ہیں جب تک علم اور تجربہ اس کی تصدیق کرتا ہے، اور جب تک تجربہ سے کوئی بات صحیح ثابت نہ ہو، ہم اس کی تقلید پر ہرگز مجبور نہیں۔

ہبۃ اللہ بن صاعد نے اپنی قرابادین کے دیباچہ میں صاف لفظوں میں یہ کہہ دیا ہے کہ "صحیح حقیقت وہی ہے جس کی تصدیق تجربہ کرے"۔ رازی نے اپنی کتاب حاوی اور فاخر میں اکثر قدما کی رائے سے اختلاف کیا ہے، اور اکثر مقامات پر ان کی رائے نقل کرنے کے بعد آخر میں اپنی رائے اور تجربہ کو بیان کیا ہے، یہی حال "فصول المہمہ فی طب الامہ" میں ابن سرافیون کا ہے۔

حریت فکر کے ساتھ ساتھ طب میں مسلمانوں کا بڑا کارنامہ ان کا عملی نظام تعلیم ہے، مسلمانوں نے پہلی مرتبہ طلبہ کو اپنے شفاخانوں میں طب کی عملی تعلیم دینا شروع کی۔ بقول صاحب طبقات الاطباء مسلمانوں سے پہلے مدرسۂ اسکندریہ میں اس قسم کی عملی تعلیم کا رواج نہیں تھا۔

مسلمانوں نے اپنے دور میں جو شفاخانے بنائے اور جن کی اساس پر بعد میں فرانس اور اٹلی میں شفاخانے بنائے گئے، ان شفاخانوں میں طلباء کی باقاعدہ حاضری ضروری تھی، رازی کہتا ہے کہ

کسی طبیب کے انتخاب کے وقت اس میں دو چیزیں دیکھنا ضروری ہیں، اولاً یہ کہ وہ جدید و قدیم طبی لٹریچر سے پوری طرح واقف ہو، اور دوسرے یہ کہ اس نے باقاعدہ ہسپتالوں کی حاضری دی ہو۔

یہ بھی ... بیمارستان عضد الدولہ میں باقاعدہ طلبہ کو لیکچر دیا کرتا تھا، اور رازی کے شاگرد پابندی سے بیمارستان میں بیماروں کا معائنہ کیا کرتے تھے، بیمارستان میافارقین میں ایک مجلس العلم قائم کی گئی تھی جس میں مریضوں کے حالات مرض پر باقاعدہ بحث ہوتی تھی، زاہد العلماء اس کا ڈائرکٹر تھا۔

اس علمی نظام تعلیم کے نتیجے میں سریریاتی تشخیص کا سلسلہ شروع ہوا، اور باقاعدہ بیماروں کے حالات مرض اور طریقہ علاج ضبط تحریر میں لائے جانے لگے، رازی کی حاوی اور فاخر، اور ابن سرافیون کی فصول المہمہ فی طب الامہ میں ایسے مریضوں کے مفصل سریریاتی حالات اور معالجات درج ہیں۔

ان حقائق کی روشنی میں طبی علوم و فنون میں تحقیقات، اکتشافات، اضافات اور اجتہادات کے باب میں عرب اور مسلم مصنفین کے ناموں، کارناموں اور ان کے دور زریں کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے وہ یکسر غیر صحیح ہے۔

اس مضمون میں حسب ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے:-

(۱) کتاب القانون — مطبوعہ مطبع نامی لکھنؤ
(۲) عیون الانباء فی طبقات الاطباء — مطبوعہ قاہرہ
(۳) معجم الاطباء — مطبوعہ قاہرہ
(۴) طبقات الاطباء — از ابن جلجل
(۵) طب العرب — یکے از مطبوعات ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور
(۶) عربین میڈیسن — از ڈاکٹر ایڈورڈ جی براؤن، مطبوعہ کیمبرج یونیورسٹی پریس
(۷) عربین میڈیسن — از ڈاکٹر ڈانلڈ کیمبل، مطبوعہ لندن،



(۸) سٹڈیز ان عربک اینڈ پرشین میڈیکل لٹریچر — از ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی، مطبوعہ کلکتہ یونیورسٹی پریس
(۹) سم لیس نون فیکٹس اباؤٹ عربین میڈیسن — از حکیم کبیر الدین صاحب
(۱۰) اخبار العلماء باخبار الحکماء — از ابن القفطی
(۱۱) تاریخ التمدن الاسلامی — از جرجی زیدان، مطبوعہ مصر
(۱۲) شرح القانون — از علامہ ابوالحسن القرشی الدمشقی
(۱۳) نفیسی — مطبوعہ مطبع یوسفی لکھنؤ
(۱۴) کتاب الفہرست — از ابن الندیم
(۱۵) وفیات الاعیان — از ابن خلکان
(۱۶) برٹش انسائیکلوپیڈیا — آرمیکل شوگر
(۱۷) کشف الظنون — از کاتب چلپی
(۱۸) الحاوی — مطبوعہ حیدرآباد دکن
(۱۹) غنی منی — مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ
(۲۰) کتاب التصریف — مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ
(۲۱) شرح الاسباب والعلامات — مطبوعہ جید برقی پریس دہلی،
(۲۲) فردوس الحکمۃ — مطبوعہ برلین

# ابو عثمان جاحظ

از جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دارالمصنفین اعظم گڈھ

(۵)

**بیان کی قسمیں** معانی کی اصلیت، حقیقت اور خصوصیت ظاہر کرنے اور ان کی قدر دل اور جنس و نوع کی تعین کرنے والی پانچ چیزیں ہیں، لفظ، اشارہ، عقد، خط اور حال جسے نصبہ بھی کہتے ہیں، ان میں سے لفظ کی بحث گذر چکی ہے، باقی قسموں کی مختصر وضاحت درج ذیل ہے:۔

**اشارہ** ہاتھ، سر، چشم و ابرو اور پہلو وغیرہ سے اشارہ کیا جاتا ہے، کپڑے، کوڑے اور تلوار سے بھی اشارہ ہوتا ہے، اس صورت میں اشارہ سے تہدید و توبیخ کا کام بھی لیا جاتا ہے، اشارہ اور لفظ کا حال دو شریکوں جیسا ہے، اور اشارہ لفظ کا بہترین معاون اور ترجمان اور اکثر لفظ کے قائم مقام ہوتا ہے، چشم و ابرو اور دوسرے اعضاء و جوارح سے اشارے میں بڑا فائدہ یہ ہے کہ جو چیزیں دوسرے سے پوشیدہ رکھی جاتی ہیں ان میں اشارہ ہی سے کام لیا جاتا ہے، شعراء کے کلام میں بھی اس کا ذکر ہے، ایک شاعر کہتا ہے:۔

اشارت بطرف العین خیفۃ اھلھا          اشارۃ مذعور و لم تتکلم

فایقنت ان الطرف قد قال مرحبا          و اھلاً و سھلاً بالحبیب المتیم

(ترجمہ) محبوب نے اپنے متعلقین کے ڈر سے خائف اور دہشت زدہ آدمی کی طرح صرف نگاہوں سے اشارہ کیا اور کوئی بات نہیں کی، اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ اس نے دیوانۂ الفت اور گرفتار محبت کو اہلاً و سہلاً اور خوش آمدید کہہ دیا ہے۔



دوسرا شاعر کہتا ہے:۔

العین تبدی الذی فی نفس صاحبھا          من المحبۃ او بغض اذا کان

والعین تنطق والافواہ صامتۃ          حتی تری من ضمیر القلب تبیانا

(ترجمہ) آنکھ آدمی کے دل کی محبت یا عداوت کو ظاہر کر دیتی ہے اور وہ زبان حال کی ایسی ترجمانی کر دیتی ہے جس سے آدمی کے دل کا حال اچھی طرح ظاہر ہو جاتا ہے، درانحالیکہ منہ خاموش ہوتا ہے۔

اشارہ آواز سے بھی زیادہ موثر اور بلیغ ہوتا ہے۔

**خط** خط کی فضیلت کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح ہوا ہے:۔ اقرأ وربک الاکرم الذی علم بالقلم، علم الانسان مالم یعلم۔ دوسری جگہ ہے:۔ ن والقلم وما یسطرون۔ اسی لیے قلم بھی ایک طرح کی زبان ہے، اور اس کا اثر دیرپا ہوتا ہے، کیونکہ زبان سے جو بات کہی جاتی ہے وہ فضا میں تحلیل ہو کر جلد ہی ختم ہو جاتی ہے اور اس سے صرف موجود اور قریب کے لوگوں ہی تک بات پہنچتی ہے، مگر قلم سے قریب و بعید اور موجود و غائب ہر شخص کو متوجہ کیا جاتا ہے، اور ہر جگہ اور ہر زمانہ میں کتابی باتیں پڑھی اور سمجھی جاتی ہیں۔

**عقد** اس سے مقصود حساب اور اندازہ ہے۔ اس کا درجہ لفظ اور خط سے کمتر ہے، اس کی فضیلت اور فائدہ کا ذکر بھی قرآن مجید میں ہے: فالق الاصباح وجاعل اللیل سکنا والشمس والقمر حسبانا ذلک تقدیر العزیز العلیم۔ دوسری جگہ ہے: الرحمن علم القرآن خلق الانسان علمہ البیان الشمس والقمر بحسبان۔ نیز فرمایا:۔ ھو الذی جعل الشمس ضیاء والقمر نورا وقدرہ منازل لتعلموا عدد السنین والحساب۔ ما خلق اللہ ذلک الا بالحق۔ ایک اور جگہ ہے۔ وجعلنا اللیل والنھار آیتین فمحونا آیۃ اللیل وجعلنا آیۃ النھار مبصرۃ لتبتغوا فضلا من ربکم ولتعلموا عدد السنین والحساب۔ اس لیے عقد بہت سے معانی اور فائدوں پر مشتمل ہے۔

اور اگر بندوں کو دنیا میں اس کا علم نہ ہو تو وہ آخرت کے حساب الٰہی کو بھی نہ سمجھ سکیں گے۔

**نصبہ یا حال** | اس سے وہ کیفیت اور حالت مراد ہے، جو لفظ و اشارہ کے بغیر زبان حال سے اپنی ترجمانی کرتی ہو، جو آسمان و زمین، خاموش و گویا، جامد و نامی، حاضر و غائب، کامل اور ناقص ہر چیز کی خلقت سے عیاں ہے، بیجان اور بے روح چیزوں میں بھی حیوان ناطق ہی کی طرح دلالت پائی جاتی ہے، خاموش شخص اور گونگی چیزیں بھی زبان حال اور دلیل و حجت سے اپنا مطلب ظاہر کرتی ہیں، اسی لیے متقدمین نے کہا ہے کہ زمین سے پوچھو کہ تمہارے اندر نہریں کس نے جاری کیں، درخت کس نے اگائے اور پھل اور ترکاریاں کس نے پیدا کیں، اگرچہ وہ زبان سے جواب نہ دیگی لیکن زبان حال سے سب کچھ بتا دیگی، خطیب اور مقرر کہتا ہے میں شہادت دیتا ہوں کہ آسمان و زمین اللہ کی نشانیاں اور اسکی معرفت کے ذرائع ہیں، ہر ایک کے اندر عبرت و بصیرت اور حجت و ثبوت پوشیدہ ہیں، اور وہ اللہ کی ربوبیت، تدبیر اور قدرت و حکمت کو ظاہر کرتی ہیں، ایک مقرر نے سکندر کا جنازہ دیکھ کر کہا تھا کہ "یہ آج کل سے زیادہ بولنے والا اور عبرت دلانے والا ہے"۔

جو چیزیں کسی مفہوم پر دلالت اور کسی کو ظاہر کرتی ہیں وہ گو خاموش اور بے حس و حرکت ہوں لیکن خبر دیتی اور اشارہ کرتی ہیں، اور اس چیز کا ہر زبان کے ادب میں رواج ہے، اور عربی شاعری کا تو یہ عام موضوع ہے، راعی کا شعر ہے:۔

ان السماء والریح مشاھدة[1] والارض تشھد والایام والبلد

لقد جزیت بنی بدر ببغیھم یوم الھبادة یوما ماله قود

(ترجمہ) آسمان، زمین، ہوائیں، زمانہ اور مقامات سب گواہ ہیں کہ تو نے بنو بدر کو ان کی بغاوتوں کا مزہ نقصان کی شکل میں دکھا دیا، یہ ایسا دن تھا کہ اس دن کا کوئی قصاص نہیں ہوگا۔

---

[1] اصل میں یہی ہے لیکن شاھدة ہونا چاہیے۔



نصیب نے سلیمان بن عبد الملک کی مدح میں کہا ہے:۔

فعاجوا فاثنوا بالذی انت اھله ولو سکتوا اثنت علیك الحقائب

لوگوں نے مڑ کر تیری خاطر خواہ تعریف کی اور اگر وہ خاموش بھی رہتے تو جھولے اور توشے تیری تعریف کرتے[1]۔

اسی سلسلہ میں زبان کے متعلق بھی جاحظ کے کچھ خیالات درج کیے جاتے ہیں:۔

"زبان ایک آلہ ہے جس سے انسان کا منشا اور قوت ارادی ظاہر ہوتی ہے، وہ ایک شاہد کی طرح مافی الضمیر کو ادا اور ایک حاکم اور جج کی طرح بے لاگ فیصلہ کرتی ہے، وہ آدمی کا نقطہ نظر بتاتی اور دوسروں کو جواب بھی دیتی ہے، واعظ و ناصح کی طرح غلط باتوں اور بری چیزوں سے روکتی ہے، اس کے ذریعہ سفارشیں کر کے ضرورتیں پوری اور اغراض و مقاصد حاصل کیے جاتے ہیں، وہ تعزیت اور تسلی دے کر درد و غم دور کرتی اور عذر و معذرت کر کے بغض و کینہ ختم کرتی ہے، اس سے دل و دماغ بہلتا اور شادکام ہوتا ہے، وہ ایک کسان کی طرح محبت کا بیج بوتی اور درانتی کی طرح نفرت و عداوت کی جڑیں کاٹتی ہے، اس کی شکر گذاری سے آدمی مزید انعام و احسان کا مستحق اور اس کے تعریف کرنے سے الفت و محبت میں اضافہ ہوتا ہے، الغرض وہ بہترین ہمدم و مونس ہے جو وحشت و تنفر کو دور کرتی ہے"۔

ایک جگہ لکھتا ہے کہ:۔

"لوگ ایسے شخص کی تعریف کرتے ہیں جس میں طلاقت لسانی، حسن بیان، فریق پر غلبہ پانے کی قوت، حجت کو واضح کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور اس کا دل جری ہوتا ہے، اور جن لوگوں میں اس طرح کی استعداد نہیں ہوتی ان کی مذمت کرتے ہیں"۔

ایک جگہ خالد بن صفوان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "اگر زبان نہ ہو تو انسان مٹی پتھر کا بت یا

---

[1] یہ بحث البیان والتبیین ج اول ص ۳۲ تا ۳۹ اور کتاب الحیوان ج ۱ ص ۱۷ و ۱۸ میں ہے۔

بے لگام جانور ہے۔"

بیان کی طرح معانی اور بلاغت وفصاحت کے متعلق بھی جاحظ کی معلومات اہم اور دلچسپ ہیں لیکن ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

اس طرح کے معلومات و مسائل جاحظ کی کتابوں میں بہت ہیں، لیکن اب ہم جاحظ ہی کے اصول کے مطابق ناظرین کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کے لیے جد سے ہزل اور سنجیدگی سے مزاح کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔

کتاب البخلاء جاحظ کی ایک اہم اور دلچسپ کتاب ہے، جو بخل کی اہمیت اور بخلاء کے واقعات پر مشتمل ہے۔ اس میں پہلے ابو العباس احمد بن عبد الوہاب کی تردید اور ملامت کرتے ہوئے کہتا ہے:

"تم کو اس پر اعتراض ہے کہ میں نے اپنے غلام سے زیادہ شوربہ بنانے کے لیے کہا ہے۔ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ "جب تم لوگ گوشت پکاؤ تو اس میں پانی زیادہ ڈال دو، تاکہ جسے گوشت نہ ملے اس کو شوربہ ہی مل جائے۔" اسی طرح تم کو میرے جوتا گانٹھنے، قمیص میں پیوند لگانے اور میرے اس خیال پر بھی اعتراض ہے کہ گانٹھے ہوئے جوتے زیادہ محفوظ رہتے ہیں، اور پیوند لگانا احتیاط اور کم خرچی ہونے کی دلیل ہے۔ تمھیں اس کی خبر نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے جوتے گانٹھتے، کپڑوں میں پیوند لگاتے اور کھانے کے بعد اپنی انگلیاں چاٹ لیا کرتے تھے، حضرت سعد بن عوف نے حضرت علیؓ کی ازار میں پیوند لگایا تھا، حالانکہ وہ قریش کے فیاض لوگوں میں سے تھے۔ امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کے کپڑوں میں کئی کئی پیوند ہوتے تھے، وہ فرمایا کرتے تھے جس کو پھٹے پرانے کپڑے پہننے میں شرم محسوس نہ ہو اس کی مشکلیں آسان اور اس کا غرور مٹ جائیگا۔

پیوند لگانا جس طرح احتیاط، ہوشیاری اور اصلاح معیشت کی دلیل ہے، اسی طرح تواضع اور فروتنی کی علامت بھی ہے۔ اس کے برعکس جو کچھ کیا جاتا ہے اس سے فضول خرچی اور اسراف



تکلف کے علاوہ کبر ونخوت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ دانشمندوں کا قول ہے کہ اصلاح معیشت بھی ایک طرح کی کمائی ہے، جس طرح آل و اولاد کی کمی ایک طرح کی فراغت اور خوشحالی ہے۔"

اس کتاب میں جاحظ نے سب سے پہلے خراسان کے شہر مرو کے بخیلوں کے واقعات نقل کیے ہیں اور اس کا سبب یہ بتایا ہے کہ وہاں کے لوگوں میں بخل طبعی ہے، وہ لکھتا ہے:

"مروزی لوگوں کے پاس جب کوئی شخص آتا یا دیر سے پہنچا ہوتا ہے تو اس سے وہ پوچھتے ہیں کہ کیا تم کھانا کھا چکے ہو، اگر وہ ہاں کہتا ہے تو یہ کہتے ہیں، اگر تم نے نہ کھایا ہوتا تو ہم نہایت عمدہ کھانا تمھیں کھلاتے، اور اگر وہ نہیں کہتا تو یہ کہتے کہ کاش تم کھا کر آتے تو ہم تمھیں نفیس اور شیریں پانی پلاتے۔

ثمامہ کا بیان ہے کہ مرو کے علاوہ ہر جگہ کے مرغوں کو میں نے دیکھا ہے کہ جب وہ دانا چگتے ہیں تو اس کو مرغیوں کے آگے کر دیتے ہیں، مگر مرو کے مرغوں کا حال یہ ہے کہ وہ مرغیوں کے منہ کے دانے بھی چھین لیتے ہیں، اس سے مجھکو اندازہ ہوا کہ بخل اور کنجوسی یہاں کی آب و ہوا کی خصوصیت ہے، اور حیوانات تک میں اس کا اثر ہے۔ میں نے یہ بات احمد بن رشید کو بتائی تو انھوں نے کہا کہ میں مرو کے ایک بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا، ان کا بچہ وہیں کھیل رہا تھا، میں نے اس سے بطور تفنن یا بطور امتحان کہا کہ مجھے اپنی روٹی کھلاؤ، اس نے کہا روٹی نہ مانگیے وہ بہت سخت اور کڑوی ہے، میں نے کہا اچھا پانی پلاؤ، اس نے کہا پانی بہت کھاری ہے، میں نے کہا خیر جیسا بھی ہو لاؤ، اس نے کہا، اس طرح کی روٹی اور پانی آپ کیا کریں گے وہ آپ کے لائق نہیں ہے، اس طرح میں نے اس سے اور کئی چیزیں مانگیں مگر وہ ہر چیز کے متعلق مجھے نفرت دلا کر انکار ہی کرتا گیا، یہ تماشا دیکھ کر باپ ہنس پڑا اور بولا اس میں ہمارا کیا قصور؟ لڑکا جو کچھ کہہ رہا ہے ٹھیک کہہ رہا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بخل یہاں کے لوگوں میں فطری طور پر پایا جاتا ہے، اور وہ ان کے مزاج اور طبیعت میں رچ گیا ہے۔

ہمارے بعض دوستوں نے چند خراسانیوں کے متعلق بتایا کہ وہ کسی سفر میں ساتھ تھے، انھوں نے

ایک مقام پر منزل کی، اور بغیر چراغ اور روشنی کے جس وقت تک رہ سکتے تھے رہے، لیکن جب کام نہ چلا تو چراغ بتی کے لیے بوجہ مجبوری آمادہ ہوئے، مگر ان میں سے ایک شخص تیار نہ ہوا، اس لئے اس کو روشنی سے محروم رکھنے کے لیے جب اس کے ساتھی چراغ جلاتے تو اس کی آنکھوں پر رومال باندھ دیتے اور جب سونے لگتے اور چراغ گل کرتے تو اس کی پٹی کھولتے"۔ (کتاب البخلاء ص ۱۴ و ۱۵)

ایک اور مروزی کا نہایت دلچسپ واقعہ ہے:۔

"مرو کا ایک آدمی ہر سال حج کرتا اور تجارت کرکے خوب نفع کماتا، حج کے سفر میں اس کا قیام ایک عراقی شخص کے یہاں ہوتا تھا، جو اس کی بڑی خاطر مدارات کرتا، اور کوئی تکلیف نہ ہونے دیتا، مروزی ہمیشہ عراقی سے کہا کرتا تھا کہ کاش آپ کبھی مرو تشریف لاتے تو مجھے بھی آپ کے احسانات وسلوک کا بدلہ کرنے کا موقع ملتا۔ اتفاق سے عراقی کو بھی ایک مرتبہ مرو جانے کی ضرورت پیش آئی اور اس کو سفر کی مشقتوں اور غریب الوطنی کی زحمتوں کی طرف سے اس لیے اطمینان تھا کہ مروزی وہاں موجود ہے۔ جب وہ مروزی کے یہاں پہنچا، اس وقت وہ اپنے ساتھیوں کے درمیان بیٹھا تھا، عراقی نے بڑھکر معانقہ کرنا چاہا لیکن مروزی کھڑا تک نہ ہوا اور نہ اس سے کوئی ایسی بات کی جس سے ظاہر ہوتا کہ ان دونوں میں کبھی کی ملاقات ہے، عراقی نے سمجھا کہ غالباً میری چادر کی وجہ سے میرا دوست مجھے پہچان نہیں رہا ہے، اس لیے چادر اتار دی اور بات چیت کرنی چاہی، مگر مروزی نے اور زیادہ بیگانگی ظاہر کی، اس طرح وہ اپنی ٹوپی اور عمامہ بھی اتارتا گیا، مگر ہر مرتبہ مروزی اور زیادہ اجنبیت ظاہر کرتا، آخر میں اس نے یہ کہکر عراقی کو لاجواب کر دیا کہ اگر تم اپنی کھال کھینچکر بھی نکال دو جب بھی میں تم کو نہیں پہچان سکتا"۔ (کتاب البخلاء ص ۱۹)

بخیلوں اور کنجوسوں کے اس طرح کے دلچسپ واقعات اس کتاب میں بہت ہیں، لیکن اس سے قطع نظر جاحظ کے حکیمانہ اقوال نقل کیے جاتے ہیں۔



جاحظ حکیم و فلسفی تھا، اس لیے اس کی کوئی تحریر بھی حکمت سے خالی نہیں ہوتی، کوئی موضوع بھی ہو وہ اس میں عقل و فراست کی باتیں ضرور کہے گا اور اکثر حکما اور دانشمندوں کے اقوال بھی نقل کرتا ہے۔

ثمامہ فرماتے ہیں کہ برائی میں مشہور ہونے سے بہتر یہی ہے کہ آدمی خیر و شر کسی نسبت سے بھی مشہور نہ ہو، متقدمین کے فضل و کمال پر ان کے متعلق لوگوں کی مختلف و متضاد رایوں سے بھی استدلال کیا جاتا ہے، اس کی سب سے واضح مثال حضرت علیؓ کی ذات گرامی ہے، ان کا ارشاد ہے کہ "میرے بارہ میں دو گروہ ہلاک ہوں گے، ایک مجھ سے مفرط عقیدت رکھنے والوں کا، دوسرے مجھ سے حد سے زیادہ بغض رکھنے والوں کا"۔ سب سے افضل و بہتر اور دین و دنیا دونوں اعتبار سے ممتاز لوگوں کے معاملہ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ (کتاب الحیوان ج ۲ ص ۳۰)

"تمہیں کبھی بھی کسی چیز کو اس لیے حقیر اور بے مایہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس کا جسم چھوٹا اور قیمت معمولی ہے، پہاڑ کے اندر ذروں اور کنکریوں سے اور آسمان کے اندر انسانی جسم سے زیادہ خدا کی قدرت و کارگیری اور اس کے وجود کی دلیل نہیں پائی جاتی، دنیا کی چھوٹی اور بظاہر حقیر ترین چیزیں بھی بڑی اور اہم چیزوں کی طرح ہی ہیں، اور حقائق و ماہیات کے لحاظ سے وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ...... کسی حیوان کے متعلق بھی اس کی خلقت اور ساخت کی وجہ سے معمولی اور حقیر ہونے کو نہ سوچو، کیونکہ جن چیزوں کے متعلق گمان ہوتا ہے کہ وہ نفع کے لحاظ سے کمتر اور معمولی ہیں، در اصل وہ اس کے برعکس ہوتی ہیں ...... جب تمہیں کوئی ایسا حیوان نظر آئے جو تمہاری امداد و اعانت میں کام نہ آسکے اور اس میں نقصان اور ایذا رسانی کی زیادتی معلوم ہوتی ہو اور اس سے بہت زیادہ محفوظ رہنے کی ضرورت ہو، جیسے سانپ، شیر، چیتے، بھڑ، بچھو، مکھیاں اور دوسرے موذی کیڑے مکوڑے تو ان کے متعلق یہ سمجھو کہ ان کا فائدہ امتحان اور آزمایش کی نوعیت سے ہے، ہر دنیا، ناگوار اور خوشگوار، اذیت رساں اور لذت بخش، معمولی اور غیر معمولی، امن و راحت بخش

اور خطرناک ہر قسم کی چیزوں سے مل کر بنی ہے۔" (کتاب الحیوان ج ۳ ص ۹۲ و ۹۳)

"قربت اور دید کی زیادتی برائی اور فساد کا سرچشمہ ہے، ایک عورت سے پوچھا گیا کہ تم نے کسی آزاد آدمی کے بجائے غلام سے کیوں زنا کیا؟ کیوں وہ اتنا زیادہ تمھیں بھا گیا، اس نے جواب دیا کہ ایک جگہ رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے اور اکثر ایک دوسرے پر نظریں پڑنے کی وجہ سے (ج ۱ ص ۸)

تم لوگ اس شخص کو جو اس لیے مال اکٹھا کرتا اور محفوظ رکھتا ہے کہ اس کی عزت و آبرو کے موقع پر کام آئے، بخیل کہکر اس کی مذمت کرتے ہو، اور ان لوگوں کو جو مال و دولت کی قدر و قیمت اور فقر و فاقہ کی ذلت و نکبت سے لاپروا ہوکر اسراف، خدا کی نعمتوں کی ناقدری اور اپنا نقصان اور دوسروں کے ساتھ فیاضی اور سخاوت کرتے ہیں، سخی کہکر ان کی تعریف کرتے ہو، تمھیں دوسروں کو متہم کرنے سے پہلے اپنے آپ کو متہم کرنا چاہیے، جو شخص اپنے متعلق غلطی کرسکتا ہے وہ دوسروں کے متعلق بدرجۂ اولیٰ غلطی کرسکتا ہے، اور جس شخص سے دنیا کے ظاہری معاملات اور چشم دید واقعات میں غلطی ہوسکتی ہے، اس کے اپنے باطن، دین اور عقل و حواس کے ذریعہ معلوم ہونے والی چیزوں میں اور زیادہ غلطی میں پڑ جانے کا امکان ہے۔ اس حقیقت سے ناواقف ہونے کی بنا پر تم سخی کی تعریف کرتے ہو جو طرح طرح کی غلطیوں میں مبتلا ہے، اور اس کی مذمت کرتے ہو جو راہ صواب پر ہے۔

مال کا محافظ وہ ہے جو اس کی حفاظت کرے اور مالدار وہ ہے جو مال کو محفوظ رکھے، مال و دولت سے مکانات اور عمارتیں، صندوق، تالے اور انگوٹھیاں وغیرہ بنتی ہیں اور جب تک معلوم ہو چکا ہے، مال کی حفاظت اس کے اکٹھا کرنے سے زیادہ دشوار ہے، حسرت اسی شخص کے لیے ہے جو دولت ضائع کرے اور غلط طریقہ پر خرچ کرنا ہی مال کو ضائع کرنا ہے۔

(کتاب البخلاء، ص ۶۳ - ۶۴)



عقلمندوں کی غلطی کا معاملہ بہت اہم اور نازک ہے، کیونکہ عقلمند پورے غور و فکر کے بعد غلطی کرتا ہے، اس لیے غور و فکر کے بقدر اس کی غلطی بھی بہت بڑی ہوتی ہے۔" (کتاب البخلاء ص ۷۷)

رونا بھی طبیعتوں کے لیے مفید اور انجام کے لحاظ سے بہتر ہے، بشرطیکہ مناسب موقع سے ہو، اور حد سے زیادہ نہ ہو، یہ در اصل رقت قلب اور سنگدلی سے بعد و نفرت کی دلیل اور مروت و وفا اور دوستوں کی غمخواری و غمگساری کی علامت ہے، عبادت گذاروں کے تقرب اور للہیت کا سب سے بڑا وسیلہ یہی ہے، صفوان بن محرز سے ان کے گریہ و بکا کی کثرت اور غم واندوہ کی شدت کے متعلق کہا گیا کہ اس سے آدمی اندھا ہو جاتا ہے، انھوں نے جواب دیا کہ آنکھوں کی شہادت یہی ہے، چنانچہ انھوں نے رونا ترک نہیں کیا اور اپنی بصارت کھو دی، یحییٰ، ہیثم اور صفوان بن محرز وغیرہ کا وصف ہی "بکا" اور یہی ان لوگوں کی شہرت و مقبولیت کا سبب تھا،

ہنسنا ہنسانا بھی فی نفسہ قبیح نہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "انہ ھو اضحک وابکی وانہ ھو امات واحیی" اس آیت میں ضحک کو حیوٰۃ اور بکا کو موت کے مقابلہ میں رکھا گیا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی جانب کوئی قبیح چیز منسوب نہیں کرسکتا اور نہ اپنے بندوں پر کسی ناقص چیز کا احسان جتا سکتا ہے، اہل عرب اپنے بچوں کا نام ضحاک، بسام، طلق اور طلیق وغیرہ رکھتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے بزرگان دین بھی ہنستے اور خوش ہوتے تھے، لوگ کسی کی تعریف کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ وہ ہنس مکھ اور خوش مزاج ہے، اور مذمت کے موقع پر خشک مزاج اور منہ بسورنے والا کہتے ہیں۔

درحقیقت ہنسی اور مذاق کا ایک محل و موقع اور ایک حد ہے، اگر وہ حد سے کم و بیش ہوں تو کمی ایک طرح کا نقص اور زیادتی عیب ہے، اسی قسم کی ہنسی اور مذاق کی مذمت کیجاتی ہے، ورنہ اگر مذاق اور ہنسی سے فائدہ مقصود ہو تو مذاق سنجیدگی اور ہنسی متانت بنجاتی ہے۔"

(البخلاء ص ۵ تا ۷)

"صبر کی کئی قسمیں ہیں، سب سے اعلیٰ قسم افشائے راز سے پرہیز ہے۔" (مجموعۂ رسائل ص ۱۳)

"کہا جاتا ہے کہ آزاد عورت بھوکی رہ سکتی ہے مگر اپنی عزت کا سودا نہیں کر سکتی۔" (ایضاً ص ۱۰)

"حسد اسی دل میں اپنی جگہ بناتا ہے جس میں ضبط اور برداشت کی قوت و صلاحیت نہ ہو، وہ انسان پر اس قدر حاوی اور غالب ہو جاتا ہے کہ آقا کو غلام پر، بادشاہ کو رعایا پر، شوہر کو بیوی پر، اور قیدی کو قید کرنے والے پر بھی اتنا اقتدار اور اختیار نہیں ہوتا۔" (ایضاً ص ۷)

"سب انسانوں میں نقص و عیب ہوتا ہے، کوئی شخص بھی گناہ سے پاک نہیں، البتہ انکے درجات و مراتب میں خوبیوں کی زیادتی اور خرابیوں کی کمی کی وجہ سے فرق ہوتا ہے، اور یہ ناممکن ہے کہ کسی شخص میں صرف خوبیاں ہی خوبیاں ہوں اور وہ ہر چھوٹی بڑی، کھلی اور پوشیدہ غلطی سے پاک ہو، بشار کہتا ہے :۔

اذا کنت فی کل الامور معاتبا　　　خلیلک لم تلق الذی لا تعاتبه

اگر تم اپنے دوست کو ہر بات میں جھڑکو گے تو (یاد رکھو) تمھیں کوئی بھی ایسا شخص نہ ملیگا جس سے کوئی ناگوار کام سرزد نہ ہو اور تمھیں اسے جھڑکنا نہ پڑے،

فعش واحدا او صل اخاک فانه　　　مقارف ذنب مرة و مجانبه

تم یا دوست کے بغیر اکیلے ہی زندگی بسر کرو ورنہ اپنے بھائی اور دوست سے یہ سمجھ کر تعلق رکھو کہ کبھی اس سے لغزشیں بھی سرزد ہوں گی۔

اذا انت لم تشرب مرارا علی القذی　　　ظمئت وای الناس تصفو مشاربه

اگر تم بار بار پانی نہیں پیتے کہ وہ گندہ ہے تو تمھیں یقیناً پیاس لگے گی، دنیا میں کون شخص ایسا ہے جس کا گھاٹ ہمیشہ صاف و شفاف ہی رہتا ہے۔ (مجموعہ رسائل ص ۲۲ و ۲۳)

البیان و التبیین کے شروع میں لقمان حکیم کا یہ مقولہ نقل کیا ہے :۔



"تین آدمیوں کو تم تین موقعوں پر پہچان سکتے ہو، حلیم کو غیظ و غضب کے موقع پر، بہادر کو خوف کے وقت اور دوست کو ضرورت کے وقت۔" انھوں نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ "جب تم کسی سے میل جول کرنا چاہو تو اس سے پہلے اسے غصہ دلا دو، اگر وہ انصاف سے کام لے تو اسے دوست بناؤ، ورنہ اس سے الگ ہو جاؤ۔" (مجموعۂ رسائل ص ۵۵)

"اصل عقلمندی اور کامل مہارت یہ ہے کہ تم نہ عجلت کرو اور نہ سستی اور اس حقیقت کو سمجھ لو کہ سرعت عجلت سے اور توقف و تامل سستی سے مختلف ہے۔" (ایضاً ص ۱۲۰)

"بہتر مدح وہ ہے جو ممدوح کے مناسب حال ہو اور سچا وصف وہ ہے جو موصوف کے شان کے مطابق ہو..... لیکن اگر مدح و توصیف میں حقیقت و واقعیت سے کام نہ لیا جائے تو وہ مدح کرنے والے کے لیے نقصان دہ اور ممدوح کے لیے بھی بے فائدہ ہے....... جس نے اپنی ایسی تعریف پسند کی جو فی الواقع اس میں نہیں ہے تو گویا وہ خود ہی اپنی تعریف کرنے والا ہے، اور جس نے جھوٹے لوگوں کو ان کے جھوٹ کا بدلہ دیا تو وہ بھی ان کے گناہ میں شریک اور شقاوت کا ساجھی ہے۔" (مجموعہ رسائل)

"عشق حد و محبت سے آگے بڑھ جانے کا نام ہے، ہر محبت عشق نہیں۔" (مجموعۂ رسائل ص ۱۶۱)

"اگر تم اپنی بات اور کام ٹھیک ٹھیک انجام دیتے ہو تو پھر جاہلوں، حاسدوں اور دشمنوں کی پرواہ نہ کرو، جاہل تو خیر جاہل ہی ہے، لیکن حاسد اور دشمن کبھی تمھاری بات کو پسند نہیں کر سکتا، دنیا کے سارے لوگوں کو خوش کرنا بہت دشوار ہے، اسی لیے کہا گیا ہے،

"رضاء الناس شیٔ لا ینال۔" (البیان والتبیین اول ص ۵۰)

جاحظ کے متعلق پہلے بتایا جا چکا ہے کہ وہ بلند پایہ اور خوش مذاق شاعر بھی تھا، گو اس کے اشعار تذکرہ و تراجم کی کتابوں میں بہت کم ملتے ہیں[1] اور جو ملتے ہیں ان کے متعلق احمد فرید رفاعی کا یہ تبصرہ درست ہے کہ

---

[1] معلوم ہوا ہے کہ اسکا دیوان بھی تھا مگر نایاب ہے۔

قیل ان للجاحظ شعرا وکنا نظرنا
فیما ینسبه له یموت بن المزرع
وابو العیناء وابو الحسن البرمکی
وغیرهم فوجدناه اقل طبقة
من بلاغته
(عصر المامون ج ۱ ص ۴۲۲)

کہا جاتا ہے کہ جاحظ کے اشعار بھی ہیں لیکن جب ہم ان شعروں پر غور کرتے ہیں جنھیں یموت بن مزرع، ابو العیناء اور ابو الحسن برمکی وغیرہ نے اس کی جانب منسوب کیا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے مرتبۂ بلاغت سے فروتر ہیں۔

لیکن اس کی جانب جو اشعار منسوب ہیں وہ بھی حکمت سے خالی نہیں ہیں، اور ان میں دانشمندانہ اقوال ملتے ہیں، مثلاً

وکان لنا اصدقاء مضوا  تفانوا جمیعا وما خلدوا

ہمارے جو دوست تھے وہ چلے گئے سب فنا ہوگئے اور ان میں کوئی باقی نہ رہا۔

تساقوا جمیعا کؤس المنون  فمات الصدیق ومات العدو

سب نے موت کا پیالہ پیا، اور دوست و دشمن سبھی موت کا شکار ہوگئے۔

اپنے ضعف کی شدت اور کرب کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

اترجو ان تکون وانت شیخ  کما قد کنت ایام الشباب
لقد کذبتک نفسک لیس ثوب  دریس کالجدید من الثیاب

کیا تم کو بڑھاپے میں بھی زمانۂ شباب کی طرح رہنے کی ہوس ہے، ایسا نہیں، تمھارا نفس تمھیں فریب دے رہا ہے، پرانا کپڑا نئے کپڑے کی طرح کیسے ہو سکتا ہے:-

ایک اور موقع پر کہتا ہے:

لئن قدمت قبلی رجال لطالما  مشیت علی رسلی فکنت المقدما



ولکن هذا الدهر تاتی صروفه  فتبرم منقوضا وتنقض مبرما

اگر کچھ لوگ مجھ سے بڑھ گئے ہیں تو (اس کا غم کیا؟) کیونکہ بارہا ایسا ہوا ہے کہ میں اطمینان سے چلا ہوں اور سب سے آگے رہا ہوں، حقیقت یہ ہے کہ انقلاب روزگار کا یہی دستور ہے کہ وہ کبھی ٹوٹی ہوئی چیز کو درست کر دیتا ہے، اور کبھی درست اور مستحکم چیزوں کو بھی توڑ پھوڑ ڈالتا ہے،

دوسرے موقع پر کہتا ہے:-

یطیب العیش ان تلقی حکیما  غذاه العلم والفهم المصیب
فیکشف عنک حیرة کل جهل  ففضل العلم یعرفه اللبیب
سقام الحرص لیس له شفاء  وداء الجهل لیس له طبیب

زندگی کے خوشگوار ہونے کا راز اس میں ہے کہ تم ایسے عاقل و دانا کی صحبت اختیار کرو جو علم صحیح اور فہم سلیم سے آراستہ ہو، تاکہ وہ جہالت کی حیرانی و سرگشتگی تم سے دور کر سکے اور علم کی فضیلت و اہمیت سے عقلمند ہی واقف ہوتا ہے، حرص و آز کی بیماری کو کبھی شفا نصیب نہیں ہوتی اور جہالت کے مرض کا کوئی طبیب نہیں۔

---

# اسلامی ہند کے نصف اول میں علوم عقلیہ کا رواج

از

جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے، ایل ایل بی، رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش

(۴)

غوری فاتحین ہندوستان میں بھی علمی سرپرستی کی ان روایات کو اپنے ہمراہ لائے اور غور و غزنی کی طرح مفتوحہ علاقوں کو مساجد و مدارس سے معمور کر دیا، چنانچہ "تاج المآثر" میں حسن نظامی نے فتح اجمیر کے بعد لکھا ہے :۔

"اساس و قواعد بتکدہا نقش دخرابی پذیرفت و معابد اصنام و اوثان بمساجد و مدارس بدل افتاد"

اس علمی سرپرستی کے ساتھ غوریوں کے یہاں معقولات بالخصوص کلام، فلسفہ اور نجوم کا چرچا بھی ملتا ہے۔

۱۔ کلام، غوریوں کا وطنی و خاندانی مذہب کرامیت تھا، لیکن غیاث الدین کے زمانہ میں شافعیت کے ساتھ اشعریت بھی غور میں داخل ہوئی، اشعریت معتزلہ و فلاسفہ کی تنزیہ مفرط و تعطیل اور حنابلہ و کرامیہ کی تشبیہ و تجسیم کے درمیان راہ وسط ہے۔ وہ جس طرح فلاسفہ کی تعطیل کی منکر ہے، اسی طرح کرامیہ کی تجسیم سے بیزار ہے، لہٰذا "تجسیم" کی تردید کے لیے کلامی مناظروں میں گرم بازاری پیدا ہو جانا فطری تھا۔

لیکن ان مناظروں کی گرم بازاری میں امام رازی کے غور آ جانے سے اور بھی شدت ہو گئی۔ پہلے وہ بامیان میں بہاء الدین سام غوری کے دربار میں پہنچے، اور اس کے نام پر "رسالہ بہائیہ" معنون کیا،



منہاج سراج نے لکھا ہے :۔

"فی الجملہ حسن عاطفت آں پادشاہ در حق علمائے اسلام زیادت ازاں بود کہ در دائرہ تحریر گنجد، علامۃ الدنیا فخر الدین محمد رازی رحمۃ اللہ علیہ رسالہ بہائیہ باسم او تالیف کردہ و مدتہا در ظل رافت و حمایت او بود"[۱]

بامیان سے وہ غیاث الدین کے یہاں تشریف لے گئے، جس نے ان کی بہت زیادہ عزت و تکریم کی اور ہرات میں ان کے واسطے ایک مدرسہ بھی تعمیر کرایا، مگر ان کا زیادہ وقت فیروزکوہ میں غیاث الدین کے دربار میں گزرتا تھا، جہاں کرامیہ فرقہ کے پیشواؤں کے ساتھ ان کے مناظرے ہوا کرتے تھے، ان میں سے ایک مناظرہ کا ذکر اوپر آ چکا ہے، ابن الاثیر نے جس انداز سے اس کی تفصیل دی ہے اس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ ایک کلامی مناظرہ تھا، کیونکہ دوسرے دن ابن القدوہ نے امام رازی کی جو شکایت کی تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ زیر بحث ظواہر نصوص (جن سے کرامیہ "تجسیم" ثابت کرتے تھے) اور دقائق کلام (جنھیں وہ فلسفیانہ تدقیقات سے تعبیر کرتے تھے) کے تصادم کا تھا، اسی لیے قاضی ابن القدوہ نے کہا تھا:

"انا لا نقول الا ما صح عندنا عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واما علوم ارسطا طالیس وکفریات ابن سینا و فلسفۃ الفارابی فلا نعلمها"[۲]

ان اشارات سے مترشح ہوتا ہے کہ فیروزکوہ میں امام رازی کی وجہ سے علم کلام کی بڑی گرم بازاری ہو رہی تھی، اور کرامیہ فرقے کے علماء اس کے مقابلے میں خود کو بے دست و پا پا رہے تھے۔

امام رازی کو کرامیوں کی شکایت پر فیروزکوہ چھوڑ کر ہرات جانا پڑا، مگر اس سے علم کلام کی گرم بازاری میں کوئی فرق نہیں آیا، وہ جہاں بھی رہے علم کلام میں کتابیں لکھتے رہے، جن میں سے بہت سی انھوں نے غیاث الدین غوری کے نام معنون کی تھیں، بدایونی نے لکھا ہے :۔

---

[۱] طبقات ناصری ص ۱۰۶ [۲] کامل لابن الاثیر ج دوازدہم ص ۵۹

"امام فخرالدین رازی رحمہ اللہ کہ لطائف غیاثی و کتب دیگر بنام برادر سلطان غیاث الدین ابو الفتح تصنیف کردہ۔"[1]

غیاث الدین کی وفات پر جب سلطان معزالدین (شہاب الدین) محمد غوری بادشاہ ہوا تو اس نے بھی امام رازی کی عزت و احترام کو برقرار رکھا، وہ اس کے مزاج میں اس قدر دخیل تھے کہ اکثر وعظ میں یہانتک کہہ دیا کرتے کہ

"اے سلطان معزالدین بعد از چندگاہ نہ ایں عظمت و شوکت تو می ماند نہ تملق و نفاق رازی"[2]

امام رازی کا قیام محمد غوری کے لشکر ہی میں رہتا تھا، اور اس لیے جب سلطان کھوکھروں کی تادیب کے لیے ہندوستان آیا تھا تو وہ بھی یہاں آئے اور جب دمیک کے مقام پر سلطان نے شہادت پائی تو وہ لشکر سلطانی ہی میں تھے، اس کی تفصیل اوپر آچکی ہے۔

ب۔ فلسفہ: اسلامی ممالک میں فلسفہ کو علی الاعلان کوئی مقبولیت نہ تھی اور فلسفی و باطنی اور ملحد و زندیق (Heretics) مترادف لفظ سمجھے جاتے تھے۔ باطنی جہاں جاتے سیاسی پروپگنڈے کے ساتھ فلسفہ کی تعلیمات کی بھی اشاعت کرتے رہے، غور میں وہ لوگ سلطان علاء الدین جہاں سوز کے عہد حکومت میں آئے تھے، سلطان نے ان کی بڑی آؤبھگت کی اور اس طرح انھیں غوریوں کی قلمرو میں دعوتی سرگرمیوں کا موقع مل گیا۔ منہاج سراج نے لکھا ہے:-

"درعہد او رسل ملاحدہ الموت بنزدیک سلطان علاء الدین آمدند و ایشان را اعزاز کرد و ہر جا بدعوت خود دعوت کردند، و ملاحدہ الموت طمع بضبط و انقیاد اہل غور دربستند و ایں معنی عیب بذیل دولت علاء الدین۔"[3]

لہذا جب اس کا بیٹا سلطان سیف الدین تخت نشین ہوا تو اس نے باطنیوں کا قلع قمع کر کے اس

[1] منتخب التواریخ بدایونی جلد اول ص ۴۳ [2] ایضاً ص ۵۳ [3] طبقات ناصری ص ۶۳



بدنامی کے داغ کو دور کیا۔ منہاج سراج نے آگے چل کر لکھا ہے:-

"و آں رسل از ملاحدہ الموت آمدہ بودند و در سر ہر کس را بیطلان و بدعت و ضلال دعوت می کردند بازطلب فرمود و جملہ را فرمان داد تا بزیر تیغ آوردند و ہلاک کردند و ہر موضعے کہ از دروغ فتنہ ایشان بوئے یافت فرمان داد تا در کل بلاد ملحد کشی کردند و ہمہ را بدوزخ فرستادند و ساحت ممالک غور را کہ معدن دینداری و شریعت پروری بود از لوث خبث قرامطہ بتیغ طہارت داد و دین غزو بسنت محمد بحت او در دل اہل غور و ممالک جبال راسخ گشت و ہمگنان نطاق عبودیت برمیان بستند و طوق طواعیت او بر گردن اخلاص نہادند۔"[1]

یہ الموت کے اسماعیلی فرمانروا حسن بن محمد کے عہد حکومت کا واقعہ ہے جو علیٰ ذکرہ السلام کے نام سے مشہور تھا، اس کے بعد اس کا بیٹا محمد بن حسن اس کا جانشین ہوا، وہ اسماعیلیت میں غلو کے ساتھ علوم معقولات میں بھی دستگاہ رکھتا تھا، روضۃ الصفا میں ہے:

"و ایں محمد در کیش ضلالت از پدر غالی تر بود و در دعوی امامت مجد تر مفرط تر۔ ادعائے حکمت و علم فلسفہ کردے بلکہ دراں فن و سائر فنون خود را منفرد پنداشتے و در علم معقول و منقول در فروع و اصول از سخنان وے روایت بسیار کردہ اند۔"[2]

کہا جاتا ہے کہ الحاد و زندقہ کی اشاعت کے لیے اس نے بالکل ہی دوسری پالیسی اختیار کی اور اس کام کے لیے امام رازی کو منتخب کیا۔ صاحب روضۃ الصفا نے لکھا ہے کہ امام رازی محمد بن حسن کے زمانہ میں آذربائیجان گئے، وہاں سے لوٹ کر رے میں اقامت اختیار کی اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے، اس سے لوگوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ امام صاحب نے ملاحدہ کی دعوت کو قبول کر لیا ہے بلکہ ان کے داعی ہیں، امام رازی نے اس تہمت سے برات کے لیے برسر منبر اسماعیلیہ کو برا بھلا کہنا شروع کیا، حاکم الموت

[1] طبقات ناصری ص ۶۵ [2] روضۃ الصفا جلد چہارم ص ۹۰

محمد بن حسن کو جب یہ خبر پہنچی تو اس نے ایک فدائی امام صاحب کے پاس بھیجا، وہ مدت تک امام صاحب کا شاگرد رہا، ایک دن تنہائی میں موقع پاکر امام رازی کے سینہ پر چڑھ بیٹھا اور چھرا نکال لیا، امام رازی نے وجہ پوچھی تو کہا کہ تم ہم پر لعن طعن کرتے ہو، امام رازی نے اس سے توبہ کی اور آئندہ خاموش رہنے کا وعدہ کیا، فدائی امام صاحب کے سینہ سے اترا اور کہا کہ امام محمد بن حسن آپ کو سلام کہتا ہے اور درخواست کرتا ہے کہ قلعہ میں تشریف لے چلیں، امام صاحب نے معذرت کی تو اس نے ۳۶۰ دینار سرخ ان کی خدمت میں پیش کیے اور کہا ہر سال اتنی ہی رقم آپ کو رئیس ابوالفضل (حاکم سجستان) سے ملا کرے گی، اس کے بعد وہ غائب ہو گیا، امام صاحب چار پانچ سال رے میں رہے اور اسماعیلیوں سے وظیفہ وصول کرتے رہے، اس کے بعد غور پہنچے، جہاں غیاث الدین اور شہاب الدین کے دربار میں رہے۔ شہاب الدین کے قتل کے بعد خوارزم بھاگ گئے، جہاں سلطان خوارزم شاہ کے دربار میں رہے۔[1]

بہرحال امام صاحب جہاں بھی رہے ان پر اسماعیلی داعی ہونے کا شبہ کیا جاتا رہا۔ رے کے زمانۂ قیام میں حسب تصریح روضۃ الصفا مشہور تھا:

"امام دعوت ملاحدہ را قبول کردہ بلکہ یکے از دعات ایشان شدہ۔"[2]

غور پہنچے تو ان کے متعلق یہی مشہور تھا، چنانچہ قاضی ابن القدوہ سے تلخ مناظرہ کے بعد جب ملک ضیاء الدین نے سلطان غیاث الدین سے جا کر ان کی شکایت کی تو حسب تصریح ابن الاثیر

| | |
|---|---|
| شکی الی غیاث الدین وذم الفخر | غیاث الدین سے شکایت اور فخرالدین رازی |
| ونسبه الی الزندقة ومذهب | کی مذمت کی اور ان کو زندقہ اور مذہب |
| الفلسفة[3] | فلسفہ کی جانب منسوب کیا، |

دوسرے دن جب قاضی ابن القدوہ نے جامع مسجد میں جا کر عوام سے شکایت کی تو ان پر وہ امام رازی

۱؎ روضۃ الصفا ج ۴ ص ۔۔ ۲؎ ایضاً ص ۔۔ ۳؎ کامل ابن الاثیر ج دوازدہم صفحہ ۵۹



کو فلاسفہ کی تعلیمات کی اشاعت کے ساتھ متہم کیا:

| | |
|---|---|
| واما علم ارسطاطالیس وکفریات | ارسطاطالیس کا علم، ابن سینا کے کفریات |
| ابن سینا وفلسفة الفارابی | اور فارابی کے فلسفہ کو ہم نہیں |
| فلا نعلمها[1] | جانتے۔ |

اور جب دمیک کے مقام پر شہاب الدین غوری کی شہادت ہوئی تو بھی امام صاحب کے متعلق اسی قسم کے شکوک و شبہات کا اظہار کیا گیا۔[2]

اس میں کوئی شک نہیں کہ امام رازی نے کلام کے ساتھ فلسفہ کی ترقی میں بھی بہت زیادہ حصہ لیا، انھوں نے شیخ کی دو مشہور کتابوں "اشارات" اور "عیون المسائل" کی شرحیں لکھیں، ہندسہ میں بھی ان کی کتابیں ہیں اور نجوم میں تو ان کی کتاب "سر المکتوم" کا ان کو بدنام کرنے کے لیے اکثر حوالہ دیا جاتا ہے، بہرحال اتنا یقینی ہے کہ امام رازی کی وجہ سے ممالک غور اور غوری مقبوضات میں فلسفہ کی بڑی گرم بازاری ہوئی،

لیکن ملاحدۂ باطنیہ کی سرگرمیاں صرف غور ہی تک محدود نہیں رہیں بلکہ غزنوی حکمرانوں کے کمزور پڑ جانے کے بعد قرامطہ نے ملتان کو پھر فتح کر لیا تھا اور ان ہی قرامطہ سے سلطان شہاب الدین غوری نے اسے ۵۷۱ھ میں فتح کیا۔ منہاج سراج نے لکھا ہے:

"و سوم سال بر سمت ملتان لشکر کشید و از دست قرامطہ ملتان را مستخلص کرد۔"[3]

اس طرح ہندوستان میں پھر قرامطہ کی دعوتی سرگرمیاں اپنی فلسفہ پسندی کے ساتھ رائج ہو گئیں، مگر سلطان شہاب الدین غوری کی فتح ملتان سے ان دعوتی سرگرمیوں کا خاتمہ نہیں ہوا، کیونکہ ان ہی اسماعیلیوں کے فدائیوں کے ہاتھ سے سلطان کی شہادت ہوئی بلکہ یہ سرگرمیاں بعد میں پورے

۱؎ کامل لابن الاثیر جلد دوازدہم ص ۵۹ ۲؎ ایضاً ص ۹۰ ۳؎ طبقات ناصری ص ۱۱۶

ہندوستان پر چھا گئیں۔ چنانچہ رضیہ سلطانہ کے عہد میں قرامطہ نے نور ترک کے ہمراہ دہلی میں
بلوہ کیا اور سینکڑوں مسلمانوں کو شہید کیا۔[1]
غرض ملاحدہ کی دعوتی سرگرمیوں اور امام رازی کی کلامی مساعی کے ضمن میں فلسفہ و معقولات
کی زمرت غور کے بعد غوریوں کے ہندوستانی مقبوضات میں بھی گرم بازاری جاری رہی۔

ج۔ نجوم :۔ غور نجوم کی ترقی کے لیے بھی قدیم زمانہ سے مشہور تھا، غوریوں کے اسلاف میں
امیر عباس بن شیث بن محمد بن سوری جو غزنوی سلطان ابراہیم (۴۵۱-۴۹۱ھ) کا ہمعصر تھا، اپنے
ظلم و تعدی کے ساتھ نجوم و ہیئت کے ساتھ اعتنا و اہتمام کے لیے بھی مشہور تھا، منہاج سراج
نے اس کے بارے میں لکھا ہے :۔

"بااین ہمہ ظلم و تعدی از علم نجوم نصیب کامل داشت و در ان نوع رنج بسیار بردہ بود و
در تحصیل آں علم جد و جہد وافر نمودہ و حظ کامل حاصل کردہ و در ولایت مندیش بخطہ
سنگہ آں قلعہ ہس رکہ بسطام ضی ک بنا کردہ بود تجدید آں عمارت فرمان داد۔ و از استاداں
کامل از اطراف جمع کردہ و دیوار ہا برہم بارہ از آں قلعہ برد و بطرف شیخ کوہ زار مرغ
برکشید و در پای آں کوہ بر بالای تلے قصر بلند بنا فرمود بہ دوازدہ برج۔ و در ہر برجے
بصورت برجے از فلک سی دریچہ نہادہ شش برج شرقی و شمالی و شش برج
غربی و جنوبی۔ و بر ہر برجے بصورت برجے از فلک بنگاشت و وضع آں چناں
کردہ کہ ہر روز خورشید از یک دریچہ بنسبت آں دریچہ کہ مطلع آں بودے در تافتے"
چنانچہ او را معلوم گشتے کہ آں روز آفتاب در کدام درجہ از کدام برج است۔"[2]

بعینہ اسی قسم کی رصدگاہ دو سو سال بعد محقق طوسی نے مراغہ میں ہلاکو کے حکم سے تعمیر کی تھی

[1] طبقات ناصری ص ۱۰۹ [2] ایضاً ص ۴۴



"حبیب السیر" میں ہے :۔

"خواجہ نصیر الدین ...... در طرف شمالی مراغہ بر بلندی رفیع بنائے رصد خانہ
اشتغال نمود مشتمل بر تماثیل اشکال افلاک ........ و بر دیوار دوازدہ گانہ
و آں رصد بر وجہے ساختہ و پرداختہ شد کہ ہر صباح پرتو نیر اعظم از ثقبہ قبہ بالا بر سطح
عتبہ می افتاد و درج و دقائق حرکت وسط آفتاب ...... از انجا معلوم می گشت۔"[1]

رصدگاہ مراغہ محقق طوسی کی عبقریت کا کارنامہ ہے، مگر یہ اسی انداز پر مبنی تھی جس پر امیر عباس نے
پانچویں صدی میں اپنی رصدگاہ بنائی تھی، اس سے نجوم و ہیئت میں اس کی حذاقت اور کمال کا
اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ منہاج سراج نے اس رصدگاہ کا ذکر کرنے کے بعد اس کی
حذاقت فنی کے بارے میں لکھا ہے :۔

"و آں وضع دلیل است بر حذاقت و استادی امیر عباس در نجوم۔"[2]

بعد میں غور میں امیر عباس جیسا حاذق ہیئت داں نہیں ہوا، اس لیے وہاں کی تاریخ
میں ہیئت و نجوم کے ساتھ کسی کے اعتنا کا ذکر نہیں ملتا، لیکن جہاں ایسے باکمال رہ چکے ہوں
وہاں سے ان فنون کا بالکلیہ جنس کاسد ہو جانا مستبعد ہے۔

بہر حال غوری فاتحین اپنے ہمراہ ہندوستان میں بھی منقولات کی ان قدیم روایات کو
لیکر آئے تھے۔ مگر اس عہد کے باکمالوں کا کوئی مستقل تذکرہ نہیں ملتا، صرف ان ہی لوگوں کا
نام تاریخ و تراجم کی کتابوں میں باقی رہ گیا ہے جو شاعر بھی تھے، اس قسم کے فضلاء کا ایک
مختصر تذکرہ عوفی نے لباب الالباب میں دیا ہے، اس نے غوریوں کے پایۂ تخت
فیروز کوہ کے بارے میں لکھا ہے :۔

[1] حبیب السیر جلد سوم جزو اول ص ۵۹ [2] طبقات ناصری ص ۴۳

"حضرت فیروز کوہ محط رجال و مہبط ارباب فضل و افضال شد، شعراء عالی قبلہ عاجات خود آنجا دانستند و فضلاء سامی مرتبت، روے بدان آوردند"[1]

ان فضلاء سامی میں شعراء کے علاوہ انواع علوم معقول و منقول کے ماہرین بھی تھے جیسے امام مجد الدین پسر امام خطیر الدین فخر الزہاد محمد بن عبد الملک الجرجانی جن کے بارہ میں عوفی لکھتا ہے :-

"امروز خطۂ لہور بہ برکات فضل و بزرگی امیر امام مجد الدین کہ ثمرۂ آن شجرہ و قرۃ العین آن بحر است معمور است وتصانیف او در انواع علوم از معقول و منقول مشہور است"[2]

ان ناموں سے اس عہد کے ہندوستان میں حکمت و معقولات کی گرم بازاری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

---

[1] لباب الالباب عوفی جلد اول ص ۱۲۲ [2] ایضاً ص ۲۲۲

# ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی ایک ایک جھلک

یہ تیموری عہد سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کے دور کی سیاسی، تمدنی اور معاشرتی تاریخ ہے، [illegible] کتاب میں مسلمانوں کی تاریخ کے روشن پہلو ہندو مورخوں کی زبانی اور ہندوؤں کے علمی کارنامے مسلمان مورخوں کے قلم سے نقل کیے گئے ہیں، یہ دار المصنفین کے سلسلۂ تصنیفات کی دوسری کتاب ہے، جس پر یوپی گورنمنٹ کی طرف سے مصنف کو ایک ہزار کا گرانقدر انعام ملا ہے۔

(مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن ایم اے) ضخامت ۵۰۰ صفحے۔ قیمت [illegible]

منیجر



# احقاقِ حق و ابطالِ باطل

از جناب صوفی نذیر احمد صاحب

جناب محترم مدیر معارف۔ السلام علیکم۔ پرسوں اپریل کا "معارف" ملا۔ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کا تبصرہ بر "جہاد اعظم کی تیاری" پڑھا، ڈاکٹر صاحب نے اپنے مشرب وجودیت کے تعصب سے مجبور ہو کر جس طرح عشق و سکر و مستی و جذب و شوق کو کل حقیقت دین قرار دینے اور خشیتِ الٰہی و رضائے الٰہی، اور اخلاص للہ و نصح لخلق اللہ وغیرہ کو جس طرح خارج از حساب و کتاب قرار دینے کی کوشش کی ہے، وہ درحقیقت دین اللہ کو دین اباحت بنانے کی خدمت ہے، رشوت میں مجھے بھی "مصنف علام" بنا دیا ہے، میں اس رشوت کو تو ایک سیدھے سادھے مسلمان کی طرح واپس کرتا ہوں، البتہ دین عشق و سکر کو دین حق کا عین بتانے کی جو حرکت ڈاکٹر صاحب نے کی ہے اس کا ابطال ضروری جانتا ہوں، میری گذارش یہ ہے کہ محبت الٰہی بیشک محرکاتِ دین میں سے ایک محرک ہے اور بڑا محرک ہے لیکن صرف ابتدائی محرک ہے، اس کے علاوہ خشیتِ الٰہی، رضائے الٰہی، اخلاص للہ اور نصح لخلق اللہ مستقل محرکاتِ دین ہیں، اور تکمیلی مراحلِ دین سے تعلق رکھتے ہیں، میری یہ بھی گذارش ہے کہ صوفیا نے بالعموم (بالکلیہ نہیں بلکہ بالعموم) جو صرف عشق و محبت کو تمام فرائض و واجباتِ دین کا محرکِ کامل بتایا ہے، اس سے کتاب دین کا اکثر و بیشتر حصہ مہمل ہو جاتا ہے، اور دین اسلام اساس و اصول میں دین مسیحیت اور بھگتی مارگ

کے قریب ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بعض صوفیا کے جو حوالے نقل کیے ہیں، ان سے تو
درحقیقت میرے ہی دعوے کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن انھوں نے ایک پکے وجودی کی طرح
بزعم خود خشیت الٰہی و رضائے الٰہی، اخلاص للہ اور نصح لخلق اللہ کے لاریب دینی محرکات
کو خاموشی کے ساتھ اور غیر محسوس طور پر داخل دفتر کر دیا ہے، جو علی الاطلاق باطل
حرکت ہے۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا۔ میں آپ سے
اور ہر دینی علم و بصیرت رکھنے والے انسان سے پوچھوں گا اور خدا کے نام پر پوچھوں گا
کہ کیا خشیت الٰہی، محبت الٰہی سے دس گنا زیادہ وسعت رکھنے والا محرک نہیں
ہے؟ خدائے واحد کی کتاب مجید پر از ابتدا تا انتہا نظر رکھ کر اس سوال کا جواب
متعین فرمایئے۔ چند اشارے میں بھی کر دیتا ہوں ۔ صرف اشارے۔ اس لیے کہ یہاں
تین سالہ شدید کشمکش کو دیانت سے آخری مرحلے پر پہنچا کر کل پرسوں پھر واپس ہونا
ہے، واپسی پر کیا حالت پیش آئے، اسے صرف خدا جانتا ہے۔ لیکن جو لوگ خدا اور رسول
صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ان کے کلام کو علم و عمل اور فکر و نظر کے ہر رخ اور ہر پہلو میں
بہ شرط اولیت دینے پر اپنے دل کو کاملاً آمادہ نہ پائیں، میری ان سے گذارش ہے کہ
وہ اس بحث میں نہ اتریں۔

شہادات: (عدم شد)۔ مومنین کی صفات۔ (الف) یدعون ربھم خوفاً
وطمعاً (ب) یدعوننا رغباً ورھباً (ج) انما یخشی اللہ من
عبادہ العلماء (د) ان الذین یخشون ربھم بالغیب لھم مغفرۃ
واجر کبیر (ر) من خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھوی فان
الجنۃ ھی الماوی (س) ذالک الکتاب لاریب فیہ ھدی للمتقین۔



ان مختصر اشارات کے علاوہ قرآن مجید کا ایک ایک صفحہ خوف، خشیت الٰہی اور تقویٰ
سے بھرا پڑا ہے۔ اسے از خود سامنے رکھ لیا جائے۔

(فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم)

(الف) راس الحکمۃ مخافۃ اللہ (ب) انی اخشاکم واتقاکم
من اللہ (ج) اللھم اجعلنی اخشاک کانی اراک حتی یوما القاک
(د) التقوی ملاک الحسنات وغیرہ

میں نے ڈاکٹر صاحب کے زیر تبصرہ اپنے رسالے میں محبت الٰہی کو بنیادی محرک
اور تمام مثبت اعمال کا باعث بتایا ہے، لہٰذا ڈاکٹر صاحب کو بے راہ رو ہونے
کی کوئی بھی گنجایش نہ تھی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ صوفیانہ لٹریچر کو خاص کر وجودیت کو
کل حقیقت دین کی صحیح تعبیر قرار دینے والوں کے ہاں صرف محبت بلکہ محبت کی بگڑی
ہوئی شکل یعنی عشق کو کل کائنات مذہب و دین قرار دیا جاتا ہے۔

مذہب عشق از ہمہ مذہب جدا است
عاشقاں را مذہب و ملت خدا است

اس میں کفر و اسلام یا عیسائیت و اسلام کا اصل و بنیاد کے لحاظ سے محض
اعتباری سا فرق رہ جاتا ہے، لہٰذا وہاں خشیت الٰہی کا گذر کہاں۔

یہ ہے ڈاکٹر صاحب کے وجودی دین و ایمان کی بنیاد جس کے اثبات کے لیے
انھوں نے چند صوفیانہ حوالے دیکر کتاب اللہ کو کتاب سکر و شوق و عشق و معاشقہ
ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنے اس مخصوص اعتقاد کو مختلف عنوانوں سے
دہراتے رہتے ہیں۔ کوئی دو برس پہلے ان کا ایک طویل مضمون رسالہ "برہان" دہلی میں

نکلا تھا۔ اس میں وصول الی المطلوب کے لیے ایک ورد یہ بھی تھا "یا کُلُّ یا کُلَّ الکُل"۔ یہ وجودیہ کا حقیقی اسم ذات ہے۔ گویا خدا، کائنات کی کلیت ہے۔ جب ان سے زبانی گفتگو میں پوچھا جائے کہ آپ تو "خالق کل" کو "عین کل" بنا کر کھلی دہریت کا ارتکاب کر رہے ہیں، تو پھر ان کی تاویلات سننے کے قابل ہوتی ہیں۔ خالق ماکان و مایکون کو کلیت ماکان و مایکون بنانا ان کا دین ہے، جو کھلی دہریت ہے۔ بلاشبہ الٰہی صوفیا میں سے بیسیوں لوگ ایسے بھی ہوئے ہیں جو چوٹی کے خادم دین ہوئے ہیں۔ ان کے متعلق جو صاف و بلا تاویل بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی مساعی صرف محبت الٰہی کے دائرے تک محدود رہی ہیں۔ وہ محبت کے دائرے کو طے کر کے خشیت کے کوچے میں نہیں آسکے۔ لہٰذا ان کا بیان، جو درحقیقت ان کی سیر و سلوک کا بالکل انفرادی نوعیت کا بیان ہوتا ہے، ناقص ہے۔ وہ پورے دین کی پوری حقیقت کے بجائے صرف دین کے ایک حصے پر قانع رہے، بلاشبہ یہ نقص ہے، لیکن کس کے مقابل نقص؟ خدا اور رسول کے کلام و بیان کے مقابل نقص ہے، اور چونکہ ہمارے لیے صرف قرآن مجید و اسوۂ رسول و بیان رسول ہی حجت ہے، اور خود ان کے لیے بھی یہی حجت ہے، لہٰذا ہمیں خدا و رسول پر قانع ہو جانا چاہیے اور ان صوفیا کے بیان و تجربے کو سپرد خدا کر دینا چاہیے۔ میں کہتا ہوں کہ خود علمائے حق میں بیسیوں ایسے ملیں گے جو "من المهد الی اللحد" خشیت محض کا نمونہ رہے ہیں۔ "انما یخشی الله من عباده العلماء" لیکن یہ کس طرح جائز ہو سکتا ہے کہ وہ خشیت محض کے علاوہ باقی محرکات دین کا انکار کر دیں، اور تمام فرائض و واجبات دین کو [illegible] صرف اسی ایک محرک کے ماتحت کر دیں۔ ڈاکٹر صاحب [illegible] مضمون [illegible] بھی "الایمان بین الخوف والرجاء" کو [illegible]



کر کے عشق کے چانٹے باز اور اس کے لوازمات سکر و مستی، جذب و شوق کو کل حقیقت دین نہیں بنا سکتے۔ بے شک محبت الٰہی محرکات دین میں سے ابتدائی محرک ہے، مگر اسے کل محرک دین قرار دینے کا نتیجہ دنیا کو خوب معلوم ہے۔ جسے معلوم نہ ہو وہ عیسائیت کی تاریخ پر نظر ڈال لے، سارے فرائض و واجبات دین کا محبت محض کو محرک کامل قرار دینے، اور خوف خدا کو خارج از بحث قرار دینے کا نتیجہ ایک اٹل لزوم کی طرح لااخلاقیت و اباحت ہوتا ہے۔ ہوا ہے اور ہوگا۔ کیا سلوک و تصوف کے زیر عنوان آج بھی سو میں کم از کم اسّی اباحتی نہیں ہیں؟ پھر اس کی بنیاد سوائے اس کے کیا ہے، کہ کتاب دین کا سارا باب خوف و خشیت ان کی ابتدائی ٹریننگ میں گم ہو جاتا ہے، لہٰذا چند ہی قدم اٹھانے کے بعد انہیں الہام ہونے لگتے ہیں کہ تمام تکالیف شرعی اُن سے ساقط ہو چکی ہیں۔ بعض تو اپنی فطری سلامتی و سعادت کے باعث ان الہامات کو شیطانی قرار دیتے ہوئے محو استعاذہ و استغفار ہو جاتے ہیں۔ مگر بہت سے "خُطُوات الشیطان" کا اتباع شروع کر دیتے ہیں۔ یہ سزا ہے ہمارے صوفیانہ سلسلے کو، محبت کو خشیت سے آزاد کر کے اُسے کل محرک دین قرار دینے کی۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے خاندان کے بعض بزرگوں کے ایسے ہی الہام کو اپنی کتابوں (فیوض الحرمین وغیرہ) میں نقل کر کے ان کی لمبی علمی توجیہات کی ہیں۔ لیکن اس کی اصل توجیہ صرف یہ ہے کہ خانقاہیت میں صرف محبت کے جذبے کو کل محرک دین سے گذر کر کل حقیقت دین قرار دیا جاتا ہے۔ ادھر جوں ہی خشیت الٰہی کی کھڑکی قلب مومن کی طرف سے بند ہوئی ویسے ہی اباحت کے الہامات کا سلسلہ شروع ہو گیا، ساتھ ہی قلب عرش الرحمٰن کے افق اعلیٰ سے غیر متعلق ہو کر اسفل السافلین کے نفس کل سے متصل ہو گیا۔ اس کے بعد الہامات

کا جو سلسلہ شروع ہوتا ہے وہ محض تکوینیات سے متعلق ہے، ان الہامات کے حصول سے کوئی شخص ابن عربی ہو سکتا ہے، ہیگل ہو سکتا ہے، بقراط ہو سکتا ہے، آئین سٹائین ہو سکتا ہے، اگر نہیں ہو سکتا تو عبد مومن باللہ نہیں ہو سکتا۔ بلا شبہ محبت کا جذبِ باہم کا عنصر سارے سلسلۂ حیوانات و نباتات وغیرہ میں موجود ہے۔

محبت سلسلۂ دین کا بنیادی قاعدہ ہے، اسی لیے ساری انسانیت کے سارے مکاتبِ فکر و نظر کو اسے کسی نہ کسی شکل میں اپنانا پڑا ہے۔ اور خشیت سلسلۂ دین کا کلام مجید ہے، جس میں محبت کے بنیادی قاعدے کو فنا کرنا ہوتا ہے، ورنہ حقیقت تقویٰ سے انسان محروم محض رہتا ہے۔ اس لیے "راس الحکمۃ مخافۃ اللہ" ایک حق مطلق ہے۔ اور "رضا" سلسلۂ دین کی صحاح ستہ ہے۔ یعنی اعتقادی دین کی عملی و اجرائی شکل۔ مجھے کامل انکار ہے کہ خشیتِ کاملہ کے حصول کے سوائے حصولِ رضائے الٰہی کا کوئی دعویٰ درست ہے اور میری دلیل ہے:۔

"رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ ذٰلک لمن خشی ربہ۔"

لہٰذا جن صوفیا نے اپنا کل دین صرف عشق و محبت کو قرار دیا ہے، اور ساتھ ہی حصول رضا کے دعوے کیے ہیں۔ ان کے یہ دعوے بے بنیاد ہیں۔ صرف آیت صدرٗ پر لاریب ایمان لانے کی ضرورت ہے، پھر شک کی کوئی گنجایش نہ رہے گی، وہ لوگ جس چیز کو رضا یا رضا بالقضا قرار دیتے ہیں، وہ فی الحقیقت صبر یا تصبر ہے، جسے غلط فہمی اور نفسیاتی دید کے باعث انھوں نے رضا قرار دے لیا ہے۔

**آخری بات** جو لوگ سچ مچ خدا اور رسول پر بلا شرط ایمان لائے ہیں ان کے لیے ڈاکٹر صاحب کے عمر بھر کے علوم وجدانی و ذوقی سے ان چند بے رنگ سطور میں کہیں زیادہ حق و واقعیت ہے۔



میں نے خود ڈاکٹر صاحب موصوف کو اسی کوچے کی طرف کھینچ لینے کی کوشش اس حد تک کی ہے کہ بعض وقت صریح ذلت تک کا سامنا کرنا پڑا۔ سلوک نقشبندی کے تمام نمایاں مقامات سے انھیں ہاتھ پکڑ کر گزارا۔ اکثر مقامات کا انھوں نے پورا پورا احساس بھی کیا۔ لیکن سال چھ ماہ کے وقفے کے بعد پھر جب ان کے ملفوظات کسی اخبار و رسالے میں دیکھے تو معلوم ہوا کہ ان کی ذہنی مصروفیت اسی وجودیت اور اسی "یا کل و یا کل الکل" کے صنم خانے کے اردگرد طواف کر رہی ہے، میرے جس کتابچے "جہادِ اعظم کی تیاری" پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے میرے جیسے بدو قسم کے مسلمان کو "مولف علام" کی رشوت دے کر اس کے مندرجات کا ابطال کرنا چاہا ہے، اس میں اسی بھگتی مارگ کی تنقید کرتے ہوئے میں نے محرکاتِ دین کی تشریح کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی امتِ اسلامیہ کو موجودہ دور کے الحادِ اعظم سے بچانے کے لیے چند نقاط معینہ پیش کیے ہیں مصنف کہلانے کے شوق سے نہیں۔ بلکہ حفاظتِ دین و ملت کے شدید احساس کے دباؤ کے ماتحت۔ اللہ اس سعی کو قبول فرمائے۔ واپس دہلی کی تیاری کرتے ہوئے یہ سطور لکھ دی گئی ہیں اور آپ سے گذارش ہے کہ بلا خوف لومۃ لائم انھیں معارف کے باب نقد و تبصرہ میں اشاعت دے کر داخلِ حسنات ہوں۔ والسلام

---

# کیمبرج یونیورسٹی میں مشرقی علوم کا مطالعہ

از پروفیسر آصف علی فیضی کیمبرج یونیورسٹی کیمبرج

پروفیسر آصف علی فیضی کا یہ مضمون اپریل ۱۹۶۳ء کے کیمبرج ریویو میں شائع ہوا تھا، یہ مضمون اپنی افادیت کے لحاظ سے اس قابل تھا کہ اردو میں اس کا ترجمہ شائع کیا جائے۔ اس کا ترجمہ علی حماد صاحب عباسی ایم اے شعبۂ انگریزی شبلی کالج اعظم گڈھ نے کیا ہے۔"

عربوں اور انگریزوں میں بڑا بعد المشرقین ہے، عرب جذباتی اور انگریز جذبات سے خالی ہوتے ہیں، عرب بڑے بڑے خیالی منصوبے بنانے میں ید طولی رکھتے ہیں، لیکن انگریز عملی دنیا کے حقائق سے کبھی تجاوز نہیں کرتے، عرب فضول خرچ اور لاابالی ہوتے ہیں، لیکن انگریز کاروباری کی طرح پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں، عرب جود وسخا اور فیاضی میں بدنام ہیں، لیکن انگریز ہمیشہ اپنا مفاد پیش نظر رکھتے ہیں، عرب کبھی باعظمت تھے، انگریز ابھی تک عظمت کے امین ہیں، عرب ۱۹۲۵ء میں بیسویں صدی سے دو چار ہوئے، اور آج انگریز اپنی عہد کے دروازے پر کھڑے ہیں، کسی عرب پر نکتہ چینی کیجئے تو وہ اس کو برداشت نہیں کرتا، اور گروہ کر دوسروں کو جن میں یہودی، عیسائی، ہندو اور بودھ شامل ہیں، طنز وتشنیع کا نشانہ بنانے لگے گا، لیکن انگریز اپنی نکتہ چینی پر خفا ہونے کے بجائے دل کھول کر ہنسنے لگے گا، بلکہ اپنے نکتہ چیں کی بات کو الٹے سراہنے لگے گا، اور اس کے جواز میں برنارڈ شا کے اقوال پیش کر کے اپنے احساس برتری کا مظاہرہ کرے گا۔

عرب اور انگریز بنیادی طور پر مغرور ہوتے ہیں، ان کا اپنا اپنا طرز زندگی ہے، ایک کی عظمت چراغ زداماں ہے، دوسرا اپنی ذات سے ناپسندیدگی کا اظہار کر کے اپنی عظمت کو پوشیدہ رکھتا ہے، سیاسی بحران کے زمانے میں عرب وزیر خارجہ بے حد مصروف ہوگا اور ناسازی مزاج کا بہانہ کر کے باہر سے آنے والے غیر ضروری اشخاص کے لیے اپنے دروازے بند کرلے گا، اس کے برخلاف انگریز ملک کے جزیرہ کلب میں گھڑی کی جیسی باقاعدگی کے ساتھ گولف کھیلتا رہیگا۔

انگریز کو اسلام، اس کے طرز زندگی اور اس کی مختلف زبانوں کی کوئی خاص تربیت نہیں ملی ہے، اس لیے وہ اس راہ میں ہر قدم پر بھٹک جاتا ہے، لیکن اس کے بھٹکنے کے بھی انداز نرالے ہوتے ہیں جو اسلام اور تاریخ اسلام پر عمدہ کتابوں کی صورت میں رونما ہوتا ہے، ڈوٹی، برٹن، فریا اشٹارک (اسلامی ملکوں کے سفرنامے) لائل، پامر، بیون، براؤن، نکلسن اور آربری (عربی ادب)، ادکلے، میور، مارگولیتھ اور برنارڈ لیوس (اسلامی تاریخ) کریسویل (اسلامی فن تعمیر) فارمر (موسیقی) میکناٹن (اول اور آخر) سدرلینڈ، ہملٹن، مورلے، بیلی، ولسن، اور رینکن (ہند و پاک میں محمڈن لا)، لارنس اور گلپ پاشا (موجودہ ریگستانی جنگ) اس بات کا ثبوت ہیں، مگر یہ سب ادھوری تربیت کا نتیجہ ہے۔

۱۔ **محمڈن لا**۔ اسلامی قانون کی اکثر غلط تشریح وتاویل کی جاتی ہے، اسلامی قانون کی اصل اساس اسلامی شریعت ہے، جو دین ومذہب، اخلاقیات، مثبت قانون، ضابطۂ دیوانی وفوجداری سب کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، شریعت میں انسان کے تمام فرائض اور طرز زندگی کے متعلق احکام درج ہیں، یہ شریعت یہودیوں کی توراۃ اور ہندوؤں کی دھرم شاستر کے مماثل ہے، اسلام کی تاریخ وتہذیب کو شریعت سے الگ کر کے سمجھنا ناممکن ہے، یہ رائے پچھلی صدی میں ولندیزی عالم سی۔ سنا وک ہرگرونج نے دی تھی، اور آجکل مغرب میں اس خیال کے ترجمان لیبیا یونیورسٹی کے پروفیسر جوزف اسکاشٹ ہیں۔

اگر جدید مروجہ قانون کا اثر و نفوذ پانچ کروڑ انسانوں پر ہے تو اسلامی قانون بیسویں صدی میں ۵۰ کروڑ ۷۰ لاکھ مسلمانوں کی زندگی اور ان کے افکار کو ایک سانچے میں ڈھالتا ہے، یہ نظام بڑا مربوط اور ہمہ گیر ہے، اس کے ماننے والے یورپ، ایشیا اور افریقہ کے بیس مختلف ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لیے عربوں اور اسلامی ملکوں کی سیاسی تحریکوں کو شریعت کے مطالعہ کے بغیر جانچنا لاحاصل ہوگا۔

بین الاقوامی قانون کے اصولوں کو گروشیس سے دو سو سال پہلے مسلمان قانون دانوں نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا، امام محمد الشیبانیؒ اس کے سب سے مشہور منادی، شارح اور ترجمان ہیں، اور قانون کی اہم کتابوں میں ججوں کے فرائض سے متعلق آداب القاضی کے ابواب میں انصاف، جنگ اور حکام عدلیہ کے صحیح طریقۂ عمل اور عوائد رسمیہ کے اصولوں پر بحث و اشارے ملتے ہیں، یہ اصول کئی سال پہلے مرتب کیے گئے تھے، اور آج بھی ہیروشما اور سوئز میں اپنا دفاع کرنے والوں کو ان اصولوں میں صلح و بقائے باہم اور مستقبل کی امید کا پیغام مل سکتا ہے۔

اس لیے میری تجویز ہے کہ،

(۱) کیمبرج یونیورسٹی کی سند قانون میں رومن لا کے بجائے ہند و پاک کے اہلسنت والجماعت کا قانون شریعت یعنی محمڈن لا بحیثیت اختیاری مضمون داخل نصاب کیا جائے اور اس کے مطالعہ پر زور دیا جائے، اس سے تہذیب و شائستگی سکھانے والے علوم کی تربیت اور ان کو فروغ ہوگا۔

(ب) کیمبرج کے بی ایل بی کے تقابلی قانون کے نصاب میں ہندوستانی طرز کی اسلامی فقہ کو جسے محمڈن لا کہتے ہیں شامل کیا جائے۔



(ج) اس قسم کے مطالعہ کے لیے عربی کی مکمل تعلیم ضروری ہے، محمڈن لا پر انگریزی زبان میں بے شمار گرانقدر اور مستند کتابیں مثلاً سر ولیم جونس، میکناٹن، سدرلینڈ، ہملٹن، بیلی، سرکار، امیر علی، ولسن، عبدالرحیم، طیب جی اور اسکاٹ نش کی کتابیں موجود ہیں۔ یہ کتابیں آسانی سے مل جاتی ہیں، جو اپنے موضوع پر حاوی اور ابتدائی مطالعہ کے لیے کافی ہیں، محمڈن لا پر لکھنے والے ان اساتذہ کو عربی برائے نام ہی آتی تھی، لیکن ان میں کام کرنے کی لگن اور اس کا جوش اور ولولہ تھا،

(د) مشرقی علوم اور اسلامی علوم کی سندوں کے دوسرے حصہ میں شافعی، ابن خلدون یا قدوری کی عربی تصانیف کے مطالعہ کو لازمی قرار دیا جائے اور فارسی کے نصاب میں ہدایہ کا فارسی ترجمہ جو ہندوستان میں بآسانی مل جاتا ہے، یا کسی اور قانونی کتاب کا مطالعہ داخل نصاب کیا جائے۔

(۲) **اردو**۔ پیاری ماں مغربی ہندی اور حسین باپ فارسی کی خوبصورت بیٹی ہے ہندی اور فارسی چچا زاد بھائی بہن ہیں، اس طرح ان کا تعلق اور رشتہ بالکل فطری ہے، مسلمانوں میں یہ رشتہ زمانۂ قدیم سے رائج ہے، اردو بنیادی طور پر ہندوستانی زبان ہے جو بعد میں عربی فارسی رسم الخط میں لکھی جانے لگی، اس پر فارسی عروض اور فارسی تصوف کی گہری چھاپ ہے، یہ عوام کی زبان ہے، درباروں اور رئیسوں کی زبان نہیں ہے، اس کے نام "زبان اردو" سے صاف ظاہر ہے کہ یہ فوجی چھاؤنیوں اور دہلی کے بازاروں میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی، گویے اس کو گلی کوچے میں گاتے پھرتے تھے، صوفیوں نے اپنی خانقاہوں میں اس کو صدق و صفا کی تعلیم کا ذریعہ بنایا، شعرا نے بازاروں، عالیشان محلوں اور عام مشاعروں میں اس کو اپنے افکار و احساسات کے اظہار کا ذریعہ بنایا،

شرفاء چاندنی چوک کی ڈیرے دار طوائفوں کے بالا خانوں پر جا کر اس زبان کی نفاست اور شائستگی سیکھتے۔ اس کی چار سو بلکہ سات سو سالہ تاریخ بڑی دلچسپ ہے، یوں تو اس کی ابتدا وسطی ہندوستان میں ہوئی لیکن رفتہ رفتہ اس کا اثر و نفوذ بڑھتا گیا اور یہ شمالی ہندوستان میں عام بول چال کی زبان بن گئی جسے ہندو، مسلمان، امیر و غریب، آقا و خادم، طوائف اور بیگم، صوفیہ و مشائخ، بابا اور سنیاسی سب استعمال کرنے لگے۔

اردو آج ہند و پاک میں دس کروڑ ہند و مسلمانوں کی زبان ہے، پاکستان اور جموں و کشمیر کی سرکاری زبان ہے، ہند و پاک کی فلموں کی زبان ہے۔ یہ فلمیں مشرقی افریقہ، ماریشس، لنکا، سنگاپور اور دوسرے مقامات پر ذوق و شوق سے دیکھی جاتی ہیں۔ یہ وہی زبان ہے جسے مہاتما گاندھی نے ہندوستانی کا نام دیا تھا، یہ ہندوستان کی سرکاری زبان ہندی سے اتنی ملتی جلتی ہے کہ شمالی ہندوستان میں ۲۵ کروڑ انسان اس کو آسانی سے سمجھ لیتے ہیں، برصغیر ہند و پاک میں بے شمار اخبارات اور مختلف موضوعوں پر ہر قسم کی کتابیں اس زبان میں شائع ہوتی ہیں، انگریز فوجی افسر اسی زبان کو رومن رسم الخط میں بڑی کامیابی کے ساتھ لکھتے تھے۔ اور حکومت ہند کی مقرر کردہ جذباتی یکجہتی کمیٹی نے اپنی اکتوبر ۱۹۶۲ء کی رپورٹ میں رومن رسم الخط کے اپنائے جانے کے سوال کو پھر سے اٹھایا ہے۔

۱۹۷۵ء سے اردو ادب کی ترقی کی رفتار بہت تیز رہی، انڈیا آفس کے کتب خانے میں اس زبان کی ۲۰ ہزار کتابیں موجود ہیں، برٹش میوزیم میں ہندوستانی کتابوں کی فہرست دیکھنے سے اس زبان کی وسعت اور اہمیت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ اس زبان میں اردو شاعری، مذہب، اور ہند و مسلم قانون کا ذخیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہے، ناول اور ڈرامے میں بھی یہ کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ البتہ جدید سائنس، تاریخ، سماجیات اور سفرنامہ پر اس میں کم کتابیں



ملتی ہیں۔ ہند و مسلمانوں نے مل کر، جن میں کایستھ، کشمیری پنڈت، پنجابی، پٹھان، شیخ، سید شامل ہیں، اس میں ادب العالیہ کے خزانے بھرے۔ اردو میری مادری زبان ہے، اس لیے اگر میں اس کے بارہ میں کلمۂ تحسین کہوں گا تو اس میں بجا طرف داری کا شائبہ ہوگا، لیکن میں تھوڑی فارسی اور عربی بھی جانتا ہوں، اس لیے دعویٰ اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ لطافت، حلاوت، ارضی محبت اور انسانی جذبات کی ترجمانی میں اردو کا مقابلہ دنیا کی کسی ترقی یافتہ زبان سے بھی کیا جا سکتا ہے، اس لیے میری تجویز یہ ہے کہ:

(ا) مشرقی علوم کی سند میں اردو خاص طور سے شامل کی جائے۔

(ب) اس کام کی ابتدا یونیورسٹی میں اردو کے ایک اسسٹنٹ پروفیسر کے تقرر سے کی جائے۔

(ج) اردو کو کیمبرج یونیورسٹی میں قدیم زبانوں کے ساتھ نہیں بلکہ جدید زبانوں کی حیثیت سے رکھا جائے۔

اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں انگلستان اور ہندوستان کے بہت قریبی تعلقات رہ چکے ہیں، اس زمانے میں ہندوستان انگلستان کی نوآبادی تھا، اور اب ہند و پاک کے کروڑوں باشندے دولت مشترکہ کا جزو ہیں، اپنی تمام باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے میری یہ تجویز ہے کہ کیمبرج کے قدیم، آزاد خیال اور تہذیب و شائستگی کے علم و علوم کے مرکز میں غالب، اقبال اور ابو الکلام آزاد جیسے آسمانِ ادب کے درخشندہ ستاروں کو اس کی آب و تاب سے ضرور منور کیا جائے۔

---

# آثارِ علمیہ و تاریخیہ

# محمد تقی خانصاحب مرحوم

از نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم

جد امجد نواب صدر یار جنگ بہادر مرحوم مغفور کے کاغذات میں یہ نامکمل مضمون مسودے کی صورت میں دستیاب ہوا جو انھوں نے اپنے والد ماجد کی وفات پر ۱۹۰۵ء میں تحریر فرمایا تھا، یہ مضمون کہیں چھپا نہیں ہے، اور اس سے اس وقت کی معاشرت پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ معارف میں نواب صاحب مرحوم کے رشحات قلم اکثر شائع ہوتے تھے، اسی مناسبت سے یہ مضمون بھی ناظرینِ معارف کی نذر ہے۔ "ریاض الرحمٰن شروانی"

میرے والد مرحوم نے ۲۰ جون ۱۹۰۵ء کو رحلت فرمائی، جناب ممدوح نے جس طرز سے ستر برس کا طویل زمانہ اس عالم میں بسر کیا وہ قدیم تہذیب کا ایک نمونہ تھا، اب اس کی مثالیں نظر نہ آئیں گی، اس لیے کہ نمونے مٹ چکے ہیں۔ برسوں سے یکسو اور کم آمیز زندگی بسر فرما رہے تھے، تاہم انکی رحلت سے جو چوٹ واقف کاروں کے دل پر لگی ہے وہ اس کا ثبوت ہے کہ صفات باعث محبت و عظمت ہیں، نہ شہرت و نام، مسلمان، ہندو اور عیسائی جو ان سے واقف تھے، یکساں انکی وفات پر صفات کو یاد کر کے تاسف کرتے ہیں۔ تعزیت ناموں میں ہر ملت کے لوگوں نے ان کی مثال کی پیروی کی مجھکو نصیحت کی ہے۔ امر حق کا اظہار ہے، نہ عقیدت فرزندانہ کا ظہور کہ



ستر برس کی عمر میں غالباً ستر منٹ ایسے نہ گذرے ہوں گے جو انھوں نے سلسل ابنائے جنس میں سے کسی کی اذیت و ایذا کے وسائل سوچنے میں صرف کیے ہوں، دنیا سے علٰحدہ نہ تھے، اول سے لیکر آخر تک ریاست کے کاروبار میں بقدر اپنے مذاق کے مصروف رہے، تاہم جن سے ان کا سابقہ رہا اس کو عزیز رہے، جنازے پر رعایا کا خاصا ہجوم تھا، جو ان الفاظ سے مرحوم کو یاد کرتے تھے، کہ چالیس برس ہم نے تیرے نیچے بہت سکھ پایا، حیف ہے اگر ایسی زندگی ختم ہو اور ابنائے ملک اس کے حالات سے بے خبر رہیں۔

ان کی پیدائش ۱۲۵۲ھ میں ہوئی تھی، محمد تقی خاں تاریخی نام تھا۔ قدیم مکتب میں تعلیم پائی جس کی حد فارسی نوشت و خواند اور زمینداری کے حساب و کتاب تک محدود تھی، تربیت تعلیم سے فائق تھی، سرگروہ خاندان دو ایسے بزرگ تھے جن میں سے ایک[1] دینداری وجود میں ضرب المثل تھے، دوسرے[2] تدبیر و دانشمندی میں۔ ان خصوصیتوں کے سوا وقار و تمکین، خودداری و پاس وضع، ہمدردی بنی نوع وغیرہ صفات جو اس عہد کے بزرگوں میں عموماً پائے جاتے تھے، دونوں میں مشترک تھے، ان اوصاف کا اثر نہ صرف گھر تک محدود تھا، بلکہ متصل ضلعوں میں چھایا ہوا تھا، اس اثر میں جو بچے پلے وہ بقدر اپنی اپنی استعداد کے فیضیاب ہوئے، مکتب سے نکلنے کے بعد دادا صاحب کچہری کے وقت بلا کر اپنے پاس بٹھاتے اور علاقے وغیرہ کو خط لکھوایا کرتے، انھوں نے رحلت کی تو ان کے بڑے بھائی[3] نے آغوش شفقت میں لیا، لکھنے پڑھنے کی تعلیم تو نہیں دی، تاہم شفقت کی یہ غایت تھی کہ اپنے لڑکوں سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، اس لیے کہ یہ سب میں چھوٹے تھے، اس زمانے کی سوسائٹی میں

---

[1] خان زماں خاں صاحب مرحوم جد نواب صدر یار جنگ مرحوم۔ (ر۔ش)، [2] محمد داؤد خاں صاحب مرحوم جد نواب سر مزمل اللہ خاں صاحب مرحوم۔ (ر۔ش)، [3] حاجی محمد داؤد خاں صاحب مرحوم۔

مردانہ فنون جیسے گھوڑے کی سواری، ورزش، بنوٹ وغیرہ سب کو عزیز تھے، یہ لڑکپن کا
دور ختم نہ کر چکے تھے کہ ان فنون کی طرف توجہ ہوئی، کشتی، لکڑی، بنوٹ وغیرہ جملہ
اقسام کو سیکھا، ہر فن کے استاد ملازم تھے، استاد اور ان کے شاگردوں کے دم سے شب و روز
یہی چرچے رہتے تھے، ہاں یہ شغلہ رئیس زادوں کی طرح نہ تھا، بلکہ پوری کوشش کے ساتھ
ورزش میں جوڑی، ڈنڑ، بیزم وغیرہ سب ہی کچھ ہوتا تھا، شمار کرنے والے کہتے ہیں کہ
پانچ پانچ ہزار ہاتھ جوڑی کے ایک ایک جلسے میں ہلائے جاتے تھے، وہ گننے والے بیٹھتے کبھی
ہزار دو ہزار ہاتھ کے بعد گننا بھول جاتے تو از سر نو شمار شروع ہوتی۔ بنوٹ اس فن
کے مشہور استاد بسم اللہ شاہ سے سیکھی، فرمایا کرتے تھے کہ حساب کیا گیا تو اسی روپے ماہوار
ان کی تنخواہ وغیرہ میں صرف ہوتا تھا، برسوں یہ چرچے اور جلسے رہے، اس عہد کی تصویر
ابتک محفوظ ہے۔ سپاہیانہ فنون کا اثر جو جسم کی ساخت اور ستھرائی پر پڑتا ہے اس کی
وہ مثال ہے۔ جوڑی کا ہلانا تو گویا زندگی بھر کا رفیق رہا۔ اب بھی برسات کے موسم میں
شب کو بالالتزام جوڑی ہلائی جاتی تھی۔

دیگر سپاہیانہ فنون کے ساتھ گھوڑے کی سواری اور شکار کا بھی انتہائی شوق
تھا، اب عرب گھوڑے عزیز ہیں، اس زمانے میں کاٹھیاواڑی گھوڑوں کی قدر تھی،
عمدہ عمدہ بچھیڑے خریدے جاتے، ان کو شوق سے پالا جاتا، پھر سواری کی جاتی۔
سواری سیدھی سادی اس زمانے میں مقبول نہ تھی، کدانا، پھندانا اور قدیم طرز کے
امتیاز سواری کے لیے لازم تھے، جو سوار جمع ہوتے ان میں کا ہر سوار اپنے اور اپنے
گھوڑے کے جوہر دکھا کر صدائے آفریں حاصل کرنے کا متمنی رہتا، فرمایا کرتے تھے کہ شروع
شروع میں والد نے ایک ٹوپی دار (شکاری بندوق کی ایک قسم) دیا تھا، جو ایک



اور عزیز بھائی کے درمیان مشترک تھا، شوق دو، بندوق ایک، ہمیشہ جھگڑا ہو جاتا، شکار
کے جس قدر اقسام ہیں، ان سب کا شوق تھا، بندوق، چیتہ، سیاہ گوش، باز، جرہ وغیرہ
شکاری پرند، کتے اور پھر ان سب کے لوازمے، خاصہ محکمہ تھا، لطف یہ کہ میر محکمہ خود تھے،
سب کے کھیل کو خود سمجھتے تھے، جب جی چاہا چیتہ بان کو گاڑی سے اتار دیا اور خود ہرن
پر چھوڑا، پھر اپنے ہاتھ سے چٹاتے تھے، بنگلے کے زینے سے چیتہ چھوڑ دیا جاتا، وہ آدمیوں
کی بھیڑ کو چیرتا پھاڑتا پاس پہنچتا اور اپنا مرغوب معمول پاتا، پھر چاٹ چکتا تو پہلو کا تکیہ
مسند کے کنارے پر بڑھا دیتے، وہ سر رکھ کر سو جاتا، اور جب تک اس کی خوشی ہوتی
سوتا رہتا، کیا خوش دلی کا عہد تھا، بھائیوں میں یک جہتی ضرب المثل تھی، دو بڑے
بھائی ریاست کے بوجھ کو اٹھائے ہوئے تھے، ان کا وقت سیر و شکار میں صرف ہوتا۔
فرماتے تھے کہ مہینوں دن کو گھر کی صورت نہیں دیکھی، پچھلی شب کو شکار کو جاتے، کچھ رات
جا لیتی تو آتے، سب قسم کا سامان شکار ساتھ رہتا، اور ہر طرح کا شکار ہوتا جاتا، ان دنوں
کاشت کم تھی گو شکار کی کثرت تھی، اب غیر مزروعہ زمین نایاب، شکار رفتہ رفتہ گورنمنٹ
کو (جانوروں کی) حفاظت کے لیے قانون کی ضرورت محسوس ہوئی، اکثر گنگا میں
کشتی کا شکار ہوتا، کئی میل تک ریاست کے دیہات گنگا کے کنارے پر ہیں، ایک گھاٹ
سے دوسرے گھاٹ تک شکار ہوتا، دوپہر تک دریا کے چڑھاؤ پر کشتی کھینچی جاتی، بعد
دوپہر بہاؤ پر چھوڑ دی جاتی، دوپہر کو دریا کا کنارہ سامنے ہوتا اور گنگا کا صحت بخش پانی
پیا جاتا، کبھی کبھی میں نے بھی یہ سماں دیکھا، اس سے صحت و تندرستی کو جو ترقی ہوتی ہے، وہ
محتاج بیان نہیں، دن بھر کی تکان کے بعد جب شام کو کشتی چادر آب پر رواں ہوتی
ہے تو عجیب موثر سماں ہوتا ہے، شفاف پانی، لطیف نسیم، غروب ہوتے ہوئے سورج

کی ٹھنڈی شعاعیں، طیور کی آوازیں اور بہت سے دلفریب عالم مل کر ایک ایسا عالم پیش کرتے تھے جو اس خاک دان سے ماورا ہوتا ہے، اس عہد کے شکار کے قصے بچوں کو کیسے عزیز معلوم ہوتے تھے، مدتوں تک میں نے اور میرے ہم سن بھائیوں نے سنے، اب میرے بچے ان کو سن سن کر خوش ہوا کرتے تھے۔

اسی عہد میں شعر و سخن کا ذوق ہوا، اردو کے دیوان ڈھونڈ ڈھونڈ کر فراہم ہوئے۔ امیرؔ و داغؔ کا ابتدائی دور تھا، ان کا کلام مدون نہ ہوا تھا، رام پور سے آنے والے جو عزیز تحفہ لاتے وہ ان کا کلام ہوتا تھا۔ "سراپائے معشوق"[1] اسی شوق کی یادگار ہے۔ حسن و عشق کے متعلق غالباً اردو کلام کا ایسا منتخب اور عمدہ مجموعہ اور نہیں ہے، ممدوح کی صحبت ایسی رنگین و شگفتہ تھی کہ با مذاق لوگوں کا مجمع ہمہ وقت رہتا تھا، حکیم پور کی صورت دیکھو تو ایک بے حقیقت موضع ہے، مگر اس کی خاک میں کشش ہے، جو مشاہیر یہاں آئے گئے، ان کی طویل فہرست مرتب ہو سکتی ہے۔ اوسط مرتبے کے لوگوں کا ذکر ہی کیا، جو لوگ با مذاق آتے خواہ وہ مولوی ہوتے یا طبیب یا کسی اور ہنر کے، ان کا دل ان ہی کے جلسے میں رہتا، خوبی یہ تھی کہ ابتذال نہ تھا، جیسے رئیس زادوں کی صحبت میں رذیل اور کمینہ مصاحب حاوی اور سر برآوردہ ہو جاتے ہیں، یہ یہاں کبھی نہیں ہوا۔ ہائے کیسی صحبت تھی جس کی یاد چالیس برسوں کے گزر جانے پر بھی آج تک تازہ ہے۔

دلی کی اخیر بہار جس کے نہ دیکھنے کی ہزاروں دلوں میں حسرت ہے، نظر سے گذری تھی۔ "غدر" ۱۸۵۷ء سے پیشتر دادا صاحب معالجے کے واسطے دلی تشریف لے گئے تھے۔ حکیم امام الدین خاں صاحب معالج تھے۔ قیام زیادہ ہوا تو عزیزوں کو بھی بلا بھیجا کر دلی کی

[1] قلمی بیاض مرتبہ محمد تقی خاں صاحب مرحوم جو اب "مولانا آزاد لائبریری" کے "حبیب الرحمن خاں شیروانی کلیکشن" میں محفوظ ہے۔ (ع۔ ش)



سیر کرا دیں، اس وقت کے ذکر میں مفتی صدر الدین خاں صاحب آزردہ کا ذکر خصوصیت سے فرمایا کرتے تھے، دادا صاحب سے مفتی صاحب کے مراسم تھے، اس لیے ان کی اولاد کے حال پر شفقت بزرگانہ فرماتے تھے۔ مفتی صاحب کا مرض الموت فالج ہوا۔ یہ عیادت کو گئے تو ہاتھ پھیلا دیے، یہ قریب گئے تو سینے سے لگا لیا، منہ چوما اور زار زار رونے لگے۔ کچھ فرمایا بھی مگر سمجھ میں نہ آیا، ان کا خادم البتہ قرینے سے بات سمجھ لیتا تھا، اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تھی، "غدر" کے بعد دلی مٹ گئی، تاہم اس کی محبت دل سے نہ مٹی، مدت تک وہاں جانے اور رہنے کا سلسلہ قائم رہا، حکیم احسن اللہ خاں صاحب سے خصوصیت کے ساتھ رسم تھی، جب تک وہ رہے مارا لجین وغیرہ ان ہی سے لیتے رہے۔ دار السلطنت کی سوسائٹی میں جو مذاق کی ستھرائی تھی، اس کا اثر مرحوم کے عادات اور وضع میں نمایاں طور پر جلوہ گر تھا۔

ان کے شوق کی فہرست بہت طویل تھی، ہر قسم کے جانوروں کے پالنے کا شوق تھا، کبوتر ابتدائے ہوش سے برابر پالے، ایک زمانے میں اڑائے جاتے تھے، اب صرف یہ شوق رہ گیا تھا کہ عمدہ جوڑے شاہ جہاں پوری رہیں۔ یا ہو بھی تھے۔ رنگین کبوتروں کا شوق کم رہا، بولنے والے پرندوں کا شوق تھا۔ ہمیشہ دس بیس پنجرے تیار رہتے تھے اور رہنے کے کمروں میں لگائے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ ہرن، چکارہ، سارس، گھوڑا، ہاتھی، بیل، بھینس وغیرہ سب ہی خوان نعمت سے فیض یاب رہے۔ ہتھیاروں کا شوق تھا، کارتوس کا چھوٹا پستول اکثر جیب میں رہتا تھا، گورنمنٹ نے جب براہ عنایت ایکٹ اسلحہ سے مستثنیٰ کیا تو خاص طور پر مسرور ہوئے، عمارت کا شوق تھا، ۲۹ برس ہوئے جب حبیب گنج کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس روز سے آج تک نہ کسی سال پزاوہ ٹھنڈا رہا اور نہ معماروں کے اوزاروں کی آواز بند ہوئی، زنانہ مکان دلی کی قدیم محل سراؤں کے انداز پر بنایا، تاہم

نئے طرز پر اس میں بعض تصرفات کیے، جن سے شان و آسائش میں ترقی ہوئی۔ یہ تصرفات اس
نواح میں مقبول ہو چکے ہیں، عمارت کی شان اور مضبوطی خاص طور پر پیش نظر رہتی تھی۔
ادھر جو عالمگیر سیلاب اس دیس میں آیا تھا، اس کے زور سے ہمارے یہاں کی ندی بھی
کچھ عرصے کے لیے دریا بن گئی۔ زنانہ مکان میں پانی بھرا اور اتنا بھرا کہ تہ خانے کی سوتوں
سے سر نکال دیا، پانی نکل جانے پر بھی تہ خانے میں پانی کے سوتے کئی روز تک جاری رہے۔
تاہم بنیاد کو نقصان نہیں پہنچا۔ آج تک وہ عمارت سربلند ہے۔ باغ کا شوق تھا، نئے ڈھنگ
کی چمن بندی اور سبزے کے ساتھ قدیم مذاق کے آب رواں اور حوض کو ملایا تھا، حوض
میں مچھلیاں تھیں۔ دیکھنے والے ان کا باغ دیکھ کر محظوظ ہوتے ہیں۔ میوہ کا شوق تھا خصوصاً
آم اور خربزے کا۔ ہر سال خاص اہتمام سے خربزے کی کاشت ہوتی، لکھنؤ کے بیج کا
اہتمام ہوتا۔ اہل مذاق ان کی خوبی کے معترف ہیں۔ آموں کے درخت رام پور، شاہ آباد،
مظفر پور وغیرہ سے فراہم کیے تھے۔ خوش قسمت کہ جو درخت لگائے، ان کی بہاریں دیکھیں
پھل کھائے اور کھلائے، باغ میں اس سال دو تازہ پھل آئے تھے، ایک کشمیری ناشپاتی
دوسرے دنی کے آڑو۔ افسوس ہے کہ ان کو نہ چکھا۔ فن تاریخ اور کتاب بینی کا شوق
تھا۔ فارسی کی مشہور تاریخی کتابیں، روضۃ الصفا، حبیب السیر، تاریخ فرشتہ، سیر المتاخرین
عماد السعادت وغیرہ مطالعے سے گزر چکی تھیں، روضۃ الصفا شباب میں دیکھی تھی، فرمایا
کرتے تھے کہ اس کے وزن سے سینے پر درد ہونے لگتا تھا۔ اردو میں جو تاریخیں چھپی ہیں
وہ بھی تقریباً سب پڑھی تھیں۔ اس طرح مسلمانوں کے تمام ممالک کی تاریخ سے اچھی طرح
واقفیت تھی۔ صحبت میں اکثر تاریخی واقعات بیان فرمایا کرتے تھے۔ شب کو کھانے تک
ہمیشہ پلنگ پر لیٹ کر اخبار یا کتاب کا مطالعہ ہوتا تھا، اردو اخبار روزانہ بالالتزام مطالعہ



فرماتے تھے۔ دن کو دوپہر کے کھانے سے پیشتر گھنٹہ آدھا گھنٹہ کتاب دیکھتے تھے۔
ہر موسم میں بہت صبح بیدار ہوتے تھے، ضروریات سے فارغ ہو کر وضو کرتے، پورا
لباس پہنتے۔ اس کے بعد سنت فجر مکان میں ادا کر کے فرض باجماعت مسجد میں
ادا کرتے، بعد نماز باغ میں تشریف لے جاتے، وہاں لب حوض ٹہل کر وظیفہ
پڑھتے، وہاں سے آکر چائے پیتے، بچوں کی چائے اپنے ہاتھ سے بناتے، بسکٹ وغیرہ بھی
خود اپنے ہاتھ سے ان کے واسطے تشتریوں میں رکھتے، بعد چائے تھوڑی دیر نشست
رہتی، حقہ لگایا جاتا، کچھ بات چیت، مختصر کام۔ اسی میں ہرنی آجاتی تو اس کو
بسکٹ کھلاتے۔ عادت دیکھو، جب تک بسکٹ نہ ملے روٹی نہ کھاتی تھی۔ باغ
کی ڈالی پیش ہوتی تھی، پاس والوں کا حصہ نکالا جاتا، بچہ وار گھوڑیاں سامنے
ٹہلتیں، تقریباً ایک گھنٹہ تک یہ نشست رہتی، اس کے بعد بھیکم پور تشریف لے جاتے،
وہاں اول اپنے بڑے بھائی صاحب کی خدمت میں جاتے، پھر ریاست کا کام
کرتے، اس میں تقریباً دو گھنٹے صرف ہوتے تھے، کام سے فارغ ہو کر اعزہ
سے ملتے۔ بھیکم پور سے واپس آکر کچھ دیر پرندوں سے لطف اندوز ہوتے، دوپہر
کا کھانا کھا کر قیلولہ فرماتے۔ اس وقت کوئی کتاب ضرور ملاحظہ فرماتے۔ ظہر
کی نماز کے بعد نشست رہتی، جس میں بعض ہم نشین شریک ہوتے، نماز عصر
سے فارغ ہو کر باغ تشریف لے جاتے، جہاں لب حوض نشست رہتی، فصل
کا میوہ کھایا جاتا۔ مغرب کی نماز کے بعد چائے نوشی ہوتی اور اس کے بعد ورزش،
رات کا کھانا عشاء کی نماز کے بعد ملاحظہ ہوتا اور پھر آرام۔ آخر عمر میں تسبیح برابر
ہاتھ میں رہتی تھی)

# مکاتیب مولانا مناظر احسن گیلانیؒ
## بنام
## مولانا سید سلیمان ندویؒ

۹ جنوری ۱۹۳۳ء
حیدرآباد دکن
جوار الجامعۃ العثمانیہ
ولی المسجد الاقصیٰ

سیدی الامام دامتم بالہناء والعافیہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مولانا فضل صاحب سے ابھی معلوم ہوا کہ بھوپال اترے تھے اور آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ خاکسار نے بھی عمداً مراسلت کا سلسلہ ترک کر دیا تھا، جس کی وجہ یہ بھی تھی کہ کوئی خاص بات لکھنے کی پیش بھی نہیں آئی تھی، نیز حیدرآباد میں میرے ساتھ جو معاملہ کیا گیا اس سے مطلع کر چکا تھا۔ بڑی حسرت اور عبرت کی بات یہ ہوئی کہ بجنسہ یہی معاملہ جو میرے ساتھ کیا گیا ڈاکٹر عبدالحق مرحوم (عربی) کے ساتھ بھی کیا گیا تھا یعنی وظیفہ دیکر بند ہوری، لیکن چار مہینے سے ان جھگڑوں کی وجہ سے نہ ان کو تنخواہ مل سکی تھی اور نہ مجھے ابتک ملی ہے۔ وہ بیچارے تنخواہ وصول کیے بغیر دوسرے عالم کی طرف اچانک روانہ ہوگئے، وہی قلب کے مرض میں گرفتہ تھے۔ ان کے مرنے کا مجھ پر بہت اثر ہوا، بلکہ خود میرا مرض گویا پھر عود کر آیا، اب بحمد اللہ اچھا ہوں۔ لکھنے کے واقعات جو ہو سکتے تھے وہ اخباروں سے معلوم ہی ہوتے ہوں گے، ان کے سوا اس وقت اور کوئی مسئلہ نہ میرے دماغ میں ہے اور نہ کسی دوسرے حیدرآبادی کے۔ دیکھئے انجام کیا ہوتا ہے؟ یہی سوال سب کے سامنے ہے۔



معارف کے ذریعہ ڈاک ایک مختصر سا مضمون بھی بھیج رہا ہوں، میری کتاب "تدوین حدیث" کا ایک حصہ ہے، ایک حصہ تو پہلے شائع ہو چکا ہے، دوسری قسط ریسرچ جرنل میں ہی شائع ہوئی ہے۔ آپ کے پاس دو وجہ سے بھیج رہا ہوں، ایک تو یہی کہ ملاحظہ فرمائیے، اور نامناسب نہ ہو تو معارف میں اسے شائع کرا دیجیے، کیونکہ ریسرچ جرنل ایک سالانہ پرچہ ہے جو چھاپ کر پیک کر دیا جاتا ہے، نہ اس کو کوئی پڑھتا ہے نہ دیکھتا ہے، میں تو محض اس خوشی سے دیتا ہوں کہ چھاپ ہو کر ایک نقل تو تیار ہو جائے گی۔ ایک کاپی اسی کی مولانا ریاست علی کے نام بھی آج بھیج رہا ہوں، مولوی فضل صاحب نے شاہ معین الدین ندوی صاحب کے نام بھی بھیجا ہے، لیکن وہ تو معارف کے نائب مدیر ہیں، اصل مدیر کا حکم ضروری ہے۔ پہلے بھی معارف ہی کی وجہ سے وہ مضمون شائع ہوا۔ فقط

نیاز مند
مناظر احسن گیلانی

اور کیا لکھوں۔ ماضی، حال، مستقبل قطعاً ایک دوسرے کے تابع نہیں رہے ہیں، دماغ کسی نتیجہ تک پہنچنے کی ہمت نہیں کرتا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔ بس اس کا اطمینان ہے کہ جو کچھ ہوگا، باذن اللہ ہوگا۔ اور اللہ ہی کے لفظ میں حکمت و رحمت سب ہی چیزوں کی ضمانت پوشیدہ ہے۔

میاں مکارم آخر پریشان ہو کر استھانواں سے گیلانی مراجعت کر گئے ہیں، اس وقت تک تو بچا! امن و عافیت سے ہے، آئندہ کون جانتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔ کوئی صاحب کشف بزرگ بھی نہیں ملتے، یہ طبقہ بھی قریب معدوم ہوگیا، ہم لوگوں نے دماغ سے اتنا کام لیا کہ دل بالکل مردہ ہو کر رہ گیا۔ اس عمر میں اگر دوسری راہ پر رہتا تو کیا کچھ حاصل نہ کر لیتا، لیکن آہ! کہ

روز گارم بگذشت بہ نادانی

۲۵ دسمبر ۱۹۳۰ء
حیدرآباد دکن

سیدی و سید المسلمین دمتم فی عصمۃ اللہ وبین عینہ

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ جی ہاں شذرۂ حقیرہ کے ارسال کے بعد جواب کا کچھ دن انتظار رہا، مگر اخباروں سے معلوم ہوا کہ اردو دوستی کے سلسلے میں آجکل گشت فرمائی ہو رہی ہے، اس لیے انتظار کو ختم کر دیا۔ غیر مترقبہ نعمت کی شکل میں اسی لیے کل کا گرامی نامہ نشاط افزا ہوا، پڑھ کر جو اثر ہو سکتا تھا ہوا، لیکن آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ آپ نے جو کچھ ارقام فرمایا اس میں میرے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ خبر دار المصنفین کی مالی حالت کی زبونی کی خبر ہے۔ اب تک اس خیال میں تھا کہ دار المصنفین دینی خدمت کا ایک ایسا ادارہ ہے، جو بحمد اللہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہے، تجارتی کتابوں کی وجہ سے عقل کو زیادہ دشواری بھی اس اطمینان کے پیدا کرانے میں پیش نہ آتی تھی، لیکن آپ نے اس اطمینان پر بھی پتھر رسید ہی کر دیا، تملا اٹھا، میرا حال تو یہ ہے کہ بجز دائرۃ المعارف کے بس یہی سمجھتا تھا کہ کوئی خاص امتیازی کام نہیں ہو رہا ہے، مکان بنتے تھے، موٹروں پر لوگ اچھلتے پھرتے تھے، ناشتہ اور ڈنر عشائیہ ظہرانہ کا زور تھا، بس ہاؤ ہو اور خورفت کے سوا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نیا واقعہ نہیں پیش آیا۔ تکلیف اگر تھی تو اسی کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم کی اشاعت کا ایک ادارہ قائم تھا، دیکھئے اس پر کیا گذرتی ہے، اگرچہ میاں ہاشم کے جنون کے بعد اس کا معاملہ بھی درہم برہم ہوتا چلا جا رہا تھا، اسی سے اندازہ فرمایئے کہ اس انقلاب سے پہلے ہی جناب ڈاکٹر ولی محمد صاحب نے خاک رکا اور ڈاکٹر حمید اللہ کا نام دائرۃ المعارف کی انتظامی وعلمی کمیٹی سے خارج فرما دیا تھا، ان ہی "ولی محمد" صاحب نے شعبۂ دینیات کے دعا یتی دن ٹٹ ختم فرما دیئے تھے۔ پی، ایچ، ڈی کا درجہ شعبۂ دینیات سے نکال دیا تھا، انکی سب سے ... عنایت اسی مرحوم شعبہ پر مبذول تھی، اور ان سے پہلے بھی بجز مرحوم قاضی محمد حسین



کے ہمیشہ غیظ وغضب کا نشانہ اعالی سے اداتی تک کا یہی وہی تاریخی مصرعہ دہرایا جائے گا کہ

ع ما من انجم کرد آں آشنا کرد

آپ سے زیادہ قرآنی آیت اذا دخلوا قریۃ کا رازداں کون ہو سکتا ہے، اسی وحشت کی سیاحی میں ساری عمر گذری۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔ زبیر الکلابی کے حوالہ سے یہ فقرہ ابن عساکر نے نقل کیا ہے کہ رأیت غلبۃ فارس علی الروم ثم رأیت غلبۃ الروم علی فارس ثم رأیت غلبۃ المسلمین فارس والروم وکل ذالک فی مدۃ خمس عشرۃ سنۃ "کل یوم ھو فی شان، یرفع ویخفض۔"

باقی آپ نے یہ عجیب سفارش فرمائی۔ تاریخ اسلامی کی تدریس کیا اس فقیر کے بس کی بات ہے، البتہ دوسرے صاحب کے متعلق آپ کی سفارش اس حیثیت سے بھی درست ہے کہ اس وقت اسلامی تاریخ کے جہاں تک میں خیال کرتا ہوں بہت اچھے استاد ہونے کی صلاحیت وہ رکھتے ہیں، علاوہ اپنے گھر کے انگریزی، فرانسیسی، قدرے جرمنی وایطالی ولاطینی زبانوں کے ذخیروں سے بھی وہ مستفید ہو سکتے ہیں، نقطۂ نظر بھی ان کا واقعات کی توجیہ میں محض مقلدانہ نہیں ہے، کام ان سے اگر لیا جائے گا تو وقت کے غیر معمولی استاذ ثابت ہوں گے، اس وقت ضرورت بھی ہے کہ ان کو کام پر لگا دیا جائے، ورنہ ضائع ہونے کا اندیشہ ہے، میرا خیال ہے کہ اس معاملہ میں آپ اپنی ممکنہ کوشش اور اثر سے کام لیجئے۔ آج کل وہ یہاں نہیں ہیں۔ واختار موسی سبعین رجلاً لمیقاتنا فاخذتھم الرجفۃ۔ سنا ہے امریکہ میں ہیں۔

بہر حال فقیر کی حد تک تو جناب والا کی یہ سفارش اور کچھ نہ ہو تو ایک سفر کی حیثیت رکھتی ہے، میں نے تو آپ کے گرامی نامہ کو اسی لیے محفوظ کر لیا ہے کہ امام المورخین فی عصرہ کی طرف سے یہ سرفرازی ہے۔ یوں بھی امراض کے ہجوم، پیرانہ سالی، تشتت بال نے کیا اس کا موقع باقی چھوڑا ہے کہ کسی نئے تدریسی مضمون کے لیے اپنے آپ کو تیار کروں۔ مولانا ظفر احمد تھانوی نے اپنے

ایک گرامی نامہ میں نے قبلہ میں ایک جگہ دعوت دی تھی۔ مگر فیصلہ کی قوت قطعاً سلب ہو چکی۔ سلب تو
پہلے ہی سے تھی لیکن غلط فہمی میں تھا کہ جو فیصلہ ہوتا ہے وہ ہوتا نہیں بلکہ کیا جاتا ہے۔ بحمد اللہ اس
غلط فہمی کو واقعات نے زائل کر دیا۔ میرا لڑکا محی الدین سلمہ بھی یہاں تحصیل ہی کے جوار میں ہے۔
یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ کوئی ملازمت اس کو مل گئی ہے، لیکن تفصیلات کا علم نہیں ہے، بہت کم
خط و کتابت کرتا ہے۔ اس کے اہل و عیال بھی مولوی معین وکیل کے اہل و عیال کے ساتھ
حمایت پور ضلع پٹنہ میں ہیں۔ ایم اے اسی سال کامیاب ہوا۔ سنا ہے کہ یونیورسٹی میں پانچواں
یا چھٹا نمبر ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ میری مدت ملازمت مارچ میں ختم ہو جاتی ہے۔ اسکے
بعد بہر حال کہیں جانا ہی پڑے گا۔ اگر راستہ اس عرصے میں عالم آخرت کا پیش نہ آگیا۔ مولوی
عبد الباری صاحب کا خط آیا تھا کہ ڈاکٹر عبد العلی صاحب کا حکم محکم فقیر اور جناب والا کے لیے
یہ ہے کہ جس طرح ممکن ہو ارض قدس میں اپنے آپ کو لیجا کر ڈال دیں۔ لیکن کام کیا ہوگا
کام کی ضرورت کہاں زیادہ ہے۔ ارض الحسنہ والنشرہ میں تصادم و تجاسہ کا شدید
اندیشہ ہے۔ اور غول یا غال کے بن کی آب و ہوا سقیم ہے۔ تاہم نہ معلوم کیوں اسی بن کی
طرف دل کھنچتا ہے، شاید کچھ بن پڑے۔ بالفعل تو میاں مکارم گیلان ہی بلا رہے ہیں۔

مناظر احسن گیلانی

ار مارچ ۱۹۳۹ء

سیدی و سید المسلمین ابقاکم اللہ وحیاکم بالصحۃ والعافیۃ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ برادرم مولوی غلام محمد صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ
تشریف لے جا رہے ہیں، خیال آیا کہ ان ہی کے ہاتھ یہ عریضہ ارسال کروں۔ مگر سمجھ میں
نہیں آتا کہ لکھوں کیا؟ حیرت اور بہت حیرت کے عالم میں ہوں۔ میری ملازمت کا یہ آخری



مہینہ ہے۔ اس وقت تک دل مطمئن تو نہ تھا لیکن ایک جگہ پڑا ہوا تھا۔ اب کہاں جاؤں،
بھوپال کی جو خبریں اخبارات سے ملتی ہیں۔ ان سے بجز اس کے کہ پریشانیوں کا اضافہ ہو
اور کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ آپ کا ارادہ کیا ہے، سردست اس کے سوا اور کچھ سمجھ میں
نہیں آتا کہ گیلانی چلا جاؤں۔ لیکن وہاں جا کر بھی سانس لینے کا موقع ملتا ہے یا نہیں
اور یہ بھی اپنا خیال ہے۔ مگر عالم نیرنگ جس کے ہاتھ میں ہے اس کی مشیت کیا ہے،
کچھ نہیں معلوم؟

آپ نے ارقام فرمایا تھا کہ لاہور سے طلبی آئی تھی۔ خاکسار نے عرض کیا تھا کہ
کہ ڈاکٹر مجور کے لیے سفارش فرمائیے۔ مگر پھر پتہ نہ چلا کہ اس کا انجام کیا ہوا۔ انکی طرف
ضرور توجہ فرمائیے۔ علی گڈھ سے میری طلبی بذریعہ ڈاکٹر نواب ناظر یار جنگ ہوئی تھی، پھر
کچھ اس کا بھی پتہ نہ چلا۔ کاش! کوئی صحیح مشورہ آپ دیتے۔ اور کیا عرض کروں۔ اگر ممکن
ہو تو اپنی خیریت اور آئندہ ارادہ سے مطلع فرمائیے۔ نیازمند محتاج دعا

مناظر احسن گیلانی

مولوی ظہور الحق پھلواری کی کتاب تسویلات الفلاسفہ غالباً میں نے آپ کے پاس
بھیجی تھی، مولوی صاحب نے ڈھاکہ سے کتاب طلب کی تھی۔

۱۳ اپریل ۱۹۳۹ء

حیدرآباد دکن

سیدی الامام العلامہ بقیۃ السلف الصالح ادام اللہ ظلالکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آخر وہ گھڑی آ ہی گئی، جس کا آج سے تیس سال
پہلے انتظار شروع ہوا تھا، درمیان میں سبکدوشی یا گلوخلاصی کی کوشش بھی کی گئی تھی، لیکن

مصلحت الٰہی نے اس وقت کی کوشش کامیاب ہونے نہ دیا تھا، ۱۳ر مارچ ۱۹۴۹ء بعد ظہر جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات کی صدارت کا جائزہ دے دیا، اور انشاء اللہ دو تین دن میں پھر اسی گاؤں کی طرف واپسی کا ارادہ ہے جس سے تقریباً نصف صدی پہلے روانہ ہوا تھا۔ جہاں جہاں کا آب و دانہ تھا وہاں رہنا پڑا۔ مولوی فضل صاحب تو موسم گرما کی تعطیل منانے کے لیے علی گڑھ تشریف لے گئے۔ معلوم نہیں آپ کے ہاں اترے یا ادھر ہی ادھر نکل گئے۔

ادھر فقیر نے اس کا پتہ چلانا چاہا کہ ماجد میاں کا وظیفہ جب جاری ہے تو آپ کا وظیفہ کیوں رک گیا، لیکن کیا عرض کروں کہ "ثریا تا بہ ثریا" بالکل نیا عالم ہو گیا ہے۔ "دبقیت فیہم کالجمال الاجرب" کوئی قابل اعتبار ذریعہ ایسا باقی نہ رہا جس سے وجہ پوچھی جائے۔ بمشکل ایک صاحب نے اطلاع دی ہے کہ آپ کے وظیفہ کی مسدودی محض غلط مغالطہ کا نتیجہ ہے۔ یعنی وقتی طور پر بیرونی ادارہ جات کی امداد روک دی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں بعض ایسے اشخاص جن کا کسی ادارے سے تعلق ہے ان کو بھی اسی فہرست میں شامل کر دیا گیا ہے۔ مثلاً وہ مولوی قطب الدین عبدالوالی فرنگی محلی کا ذکر کرتے تھے کہ فرنگی محل

۱؎ مطلب یہ ہے کہ اشخاص کے نام جو وظائف و مناصب وغیرہ جاری تھے ان کو موجودہ حکومت نے بند نہیں کیا ہے۔ البتہ ممالک محروسہ سے باہر جن ادارہ جات کو امداد ملتی تھی، سر دست مسدود کر دیا گیا ہے۔ آپ کا وظیفہ شخصی و ذاتی ہے۔ جیسے دوسروں کے نام جاری ہے، آپ کے نام بھی نہ جاری ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ ماجد میاں کو وظیفہ ماہ بماہ پہنچ رہا ہے۔ حد یہ ہے کہ آج ہی بینک میں معلوم ہوا کہ حکیم حبیب ندوی کو تیس روپے کہ جو سالہا سال سے بطور امداد ملتے تھے، وہ بھی جاری ہے۔



ہے۔ مثلاً وہ مولوی قطب الدین عبدالوالی فرنگی محلی کا ذکر کرتے تھے کہ فرنگی محل کے مدرسۂ نظامیہ سے تعلق کی بنیاد پر ان کے شخصی وظیفہ کو بھی مسدود کر دیا گیا تھا، لیکن انھوں نے درخواست پیش کی، امید ہے کہ جاری ہو جائے گا۔

ان صاحب کا خیال ہے کہ دار المصنفین اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے ساتھ آپ کا جو تعلق ہے غالباً اسی تعلق کا یہ کرشمہ ہے، کہتے تھے کہ مولانا بھی اس سلسلے میں ملٹری گورنر کے نام کوئی درخواست اگر بھیج دیں گے تو مغالطہ کا ازالہ ہو جائے گا۔ مگر میری سمجھ میں نہ آیا کہ آپ سے یہ کیسے عرض کروں، چاہئے تو یہی تھا کہ ہم جیسے نیاز مند اس مرحلہ میں کام آ جاتے، لیکن کروں کیا

خلت الدیار فلا کریم یرتجی
منه النوال ولا ملیح یعشق

تاہم اس سلسلے میں بالواسطہ یا بلاواسطہ آپ اگر کچھ کر سکتے ہیں تو ازالۂ وہم کے لحاظ سے غالباً مناسب نہ ہو۔ میرے چھوٹے بھائی برادرم مظہر احسن سلمہٗ معاشیات کے لکچرار جامعہ میں ہیں، ان کو کہہ دیا ہے کہ اس سلسلے میں جو تگ و دو تم سے ممکن ہو کیجیو، اور چلتے ہوئے ڈاکٹر رضی الدین صاحب کو بھی کہہ دوں گا، آپ سے وہ خاص عقیدت رکھتے ہیں، مگر وہ بیچارہ خود بے بال و پر ہو چکا ہے۔

معلوم نہیں بھوپال کا کیا حال ہے اور مآل کیا ہونے والا ہے؟ ممکن ہو تو اس عریضہ کا جواب گیلانی کے پتہ سے اگر خیال آ جائے تو دیجئے، انشاء اللہ وہاں پہنچ کر میں خود لکھوں گا۔ اس وقت تو صرف حیدرآباد چھوڑنے کی اطلاع آپ کو دے رہا ہوں، علی گڑھ سے نامہ و پیام کا سلسلہ پہلے جاری ہوا تھا، مگر ادھر بند ہے۔ آپ نے ارقام فرمایا تھا کہ علی گڑھ

پہونچکر لوگوں سے مل لوں۔ لیکن دل اس قسم کے امور میں ملنے ملانے پر آمادہ نہیں،
اور سچی بات یہ ہے کہ نہ عمر ہی ملازمت کی رہ گئی ہے اور نہ بحمد اللہ کچھ ایسی تنگی ہے،
اس قسم کے کسی مقام کی طرف تھوڑا بہت میلان اگر باقی ہے تو صرف مشغلہ اور
دل بستگی کے لیے، بہر حال حق تعالیٰ سے دعا فرمایئے۔ نیاز مند

مناظر احسن گیلانی

۳ر مئی ۱۹۴۹ء

سیدی و سید المسلمین، مخدوم و محترم متعنا اللہ بطول بقائکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ ابھی ابھی آپ کا گرامی نامہ موجب عزت افزائی ہوا
بے چارے ڈاکٹر ظفیر صاحب مرحوم کی وفات کی خبر سے افسوس ہوا، علاوہ برادری کے
تعلقات کے فقیر کے خاص ملنے والوں میں تھے۔ غفر اللہ لہ، آپ کے گرامی نامہ سے بھی اور
ماجد میاں کے خطوط سے بھی علی گڑھ کا حال معلوم ہوا۔ میں بالکل حیران ہوں، آپ کے اور
ماجد میاں صاحب کے اس طرز عمل کے سمجھنے سے معذور ہوں کہ علی گڑھ کے لیے
آپ دونوں حضرات فقیر کے لیے کوشش کیوں فرما رہے ہیں۔ میں تو پریشان تھا کہ
علی گڑھ سے واقعی طلبی ہوئی تو اس طلبی کا مقابلہ کیسے کر سکوں گا، ڈاکٹر صاحب سے گونہ تعلقات
تھے۔ لیکن اس شخص کو تو میں اپنا محسن خیال کرتا ہوں جس نے ڈاکٹر صاحب کے دل سے میرا
خیال نکال دیا، اگرچہ اس کا افسوس ضرور ہوا کہ کسی غلط بات کو اس نے منسوب کیا، آپ نے
لکھا ہے کہ "معاملات میں گڑبڑ کرتے ہیں"۔ خدا جانے اس کا کیا مطلب ہے؟ ماجد میاں
نے لکھا کہ ان ہی حمید آبادی صاحب نے ان کو باور کرایا کہ میں سیاسی آدمی ہوں،
اس کا بھی کوئی منتج حال سمجھ میں نہ آیا۔ اگر آپ سے یا ماجد میاں سے ہو سکے تو ڈاکٹر صاحب



کے دل سے اس غلط خیال کا ازالہ فرما دیجئے۔ باقی علی گڑھ سے جان بچی، اس سے
تو بہت خوش ہوں، میری صحت ہی اس قابل نہیں ہے کہ ملازمت کی ذمہ داریوں
کو قبول کروں، اور بحمد اللہ بظاہر معاشی حیثیت سے بھی کوئی ضرورت ملازمت کی
معلوم نہیں ہوتی، اور علی گڑھ کے متعلق جب یہ خیال ہے تو آپ اندازہ فرما سکتے ہیں
کہ لاہور جیسے بھڑ کے چھتے میں اپنی پیرانہ سالی کے ان دنوں میں ہاتھ دینے کی جرأت
کہاں تک کر سکتا ہوں، بس آپ حضرات کی سب سے بڑی دستگیری یہ ہوگی کہ عفاف
و قناعت کے جذبات کو قوی کرنے میں میری مدد فرمایئے، یہی آپ کو لکھ رہا ہوں، اور
ماجد میاں سے بھی اسی کی التجا کر چکا ہوں،

۱ر اپریل ۱۹۴۹ء کو رقیت کی زنجیر پاؤں سے نکلی، ستائیس اٹھائیس سال کی اس طویل
مدت میں، راحت و سکون کے ان پہلوؤں کو تقریباً بھول چکا تھا جو آزادی کے دنوں
میں میسر آئی ہے۔ بحمد اللہ کہ جیسے جیسے دن گذر رہے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک
پہاڑ تھا، جو بتدریج سینے سے ٹل رہا ہے۔ قلب کا مسلسل یہی حال رہا تو شاید ملازمت کے
لفظ سے مجھ پر لرزہ طاری ہونے لگے گا۔ افسوس کہ زندگی اب ختم ہو رہی ہے۔ آپ لوگوں
نے آزادی کے ان دنوں کو ایام شباب میں گذارا، اور میرے سامنے یہ عہد افسوس ہے
کہ سر شام آئی ہے، بہر حال ڈاکٹر ذاکر صاحب کے دل سے ممکن ہو تو اس خیال کا ازالہ
فرما دیجئے، ورنہ چھوڑ دیجئے۔ تاکہ مجھے اسی ذریعہ سے وہ بھول جائیں۔ اب تو جی یہی
چاہتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، جاننے والوں کے حافظہ سے حق تعالیٰ اس فقیر کو نکال لیں
بحمد اللہ کہ گیلانی اہل و عیال کے ساتھ بخیر و عافیت پہنچ گیا۔ تقریباً بیس دن اسی گاؤں
میں گذار چکا ہوں، بظاہر امن و امان بھی معلوم ہوتا ہے اور "لہ الملک" کے بعد دوسرے

کی ملک میں کسی غیر کے اقتدار و تصرف کا خیال ہی کیوں کیا جائے ما اصاب من مصیبۃ
فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نبرأھا ان ذالک علی
اللہ یسیر نص قطعی محکم ہے۔

.......... کا حال آپ نے جو لکھا ہے سن کر افسوس بھی ہوا اور عبرت بھی۔
خدا جانے اس دنیا کی زندگی اگر ان تغیرات کا شکار نہ ہوتی تو قلوب کی چپیدگی
کا اس کے ساتھ کیا حال ہوتا۔ اس خبر سے کہ میں عشق کی نعمت سے سرفراز ہوا۔
شروانی صاحب کا گرامی نامہ آیا تھا، خط میں ان کے تو وہی آن بان اور
وہی شروانی شان موجود تھی، جواب دے دیا تھا، یہاں سے بھی لکھنے کا ارادہ
ہے۔ ڈھاکہ کی خبر مولوی نفضل نے خدا جانے کہاں سے اڑائی، الاموال والاولاد
کے ساتھ بحمد اللہ دل کے تعلق کی یہ نوعیت نہیں ہے۔ میرا خیال تو یہی ہے، خدا
کرے غلط ہو کہ علی گڈھ کے واقعات میں ہمارے خاص کرم فرماؤں کا بھی ہاتھ ہے،

انھم فی واد ونحن فی واد

رانچی جب تشریف فرمائی ہو تو دسنہ سے بھی گذرتے جایئے، اگر
اس کا ارادہ ہو تو ضرور مطلع فرما دیجئے گا، اس کی ہمت کیسے کروں کہ گیلانی
کو اپنی رونق افروزی سے منور فرمانے کا موقع دیجئے، لیکن دسنہ تک پہنچکر
قدم بوسی کی سعادت انشاء اللہ یہ فقیر حاصل کرے گا۔

آموں کی بہار بحمد اللہ گیلانی کی ایسی نہیں ہے کہ اس پر بہار کا اطلاق نہ کیا جائے
لیکن پکائی کے لیے موسم میں جن آثار کی ضرورت ہے وہ نہیں پائے جا رہے ہیں،
بڑی تیز پروا ہوا چل رہی ہے۔ ضرورت پچھوا کی تھی، لیکن جس کا ملک ہے اسکے



نزدیک پروا ہی کی ضرورت ہوگی، ہم دخل دینے والے کون؟
برادرم مکارم سلمہ سلام عرض کرتے ہیں اور گیلانی تشریف لانے کی
دعوت دیتے ہیں، کاش! ایسا ہوتا۔
آپ کی اموار کی اجرا کا حال احمد میاں کے خط سے معلوم ہو چکا تھا، میں نے
عرض کیا تھا کہ صرف کسی غلط فہمی کے تحت اس کی مسدودی ہوئی ہے، ورنہ
شخصی وظائف عموماً جاری ہیں۔

نیاز مند
مناظر احسن گیلانی

---

# ادبیات

## عیدگاہِ عاشقاں

زائرِ حرم از جناب حمید صدیقی

پیشِ نظر حریمِ رسالت ہے آجکل
دنیائے دل، خیال کی جنت ہے آجکل

چھایا ہوا ہے دل پہ عجب کیفِ بیخودی
وہ غائبانہ لطف و عنایت ہے آجکل

شیشہ آبگینۂ دل کو نہ چھیڑیے
لبریز سوز و سازِ محبت ہے آجکل

عالم تمام مطلعِ انوار بن گیا
اتنی تجلیات کی کثرت ہے آجکل

دیدِ حرم کی جیسے مدینے میں عید ہو
کعبے میں بھی وہ جشنِ مسرت ہے آجکل

زمزم کے گرد تشنہ لبوں کا ہے اژدحام
رندوں پہ خاص بارشِ رحمت ہے آجکل

پھر اہتمامِ خاص سے بیت الحرام میں
صف بستہ حاجیوں کی جماعت ہے آجکل

پھر استلامِ رکنِ یمانی کے ذوق میں
بیتابیِ طواف و زیارت ہے آجکل

پھر میرے جذبِ شوق نے پہنچا دیا مجھے
پھر ملتزم شریف سے قربت ہے آجکل

دل کھینچ رہا ہے دیکھ کے آغوشِ شوق سے
ایسی حطیمِ پاک میں نزہت ہے آجکل

کیا کیا صفا و مروہ پہ جوش و خروش ہے
اہلِ جنوں کی اوج پہ قسمت ہے آجکل

رونق ہی اور ہے جبلِ بوقبیس کی
آئینہ دارِ جلوۂ رحمت ہے آجکل



غارِ حرا وہ خلوتِ راز و نیازِ شوق
صد جلوہ گاہِ نور و لطافت ہے آجکل

پیشِ نگاہِ شوق مناظر منیٰ کے ہیں
دل بے نیازِ خلوت و جلوت ہے آجکل

ہٹتی نہیں نگاہ جدھر پڑ گئی حمید
ہر شے میں ایک حسن ہے ندرت ہے آجکل

## غزل

از جناب ساجد امیٹھوی

تڑپ کے نہ کبھی ہم کسی کا نام لیے
کچھ اس خلوص سے ظالم نے انتقام لیے

افق سے دور متاعِ فروغِ جام لیے
کھلے ہیں پھول چمن میں بہار خام لیے

سکون جب ملا تیرا بغیر نام لیے
خود ہم نے اپنی محبت سے انتقام لیے

نظامِ گردشِ دوراں بدل گیا لیکن
مزاجِ صبح نہ بدلا مذاقِ شام لیے

کچھ ایسے موڑ بھی آئے تری محبت میں
جہاں خرد سے بھی ہم نے جنوں کے کام لیے

نہ چھیڑ مطربِ رنگیں نوا تو سازِ نہ چھیڑ
کہ دل ہے چوٹ صدائے شکستِ جام لیے

مجھے تو دیکھ کہ شیشہ بدست و جام بکف
بہک گیا ہوں تو ساقی نے ہاتھ تھام لیے

گزر گئے غمِ دار و رسن سے دیوانے
سکوتِ شوق میں دنیا کا اژدحام لیے

ٹھہر نہ جائے کہیں نبضِ عالمِ امکاں
حیات و موت کا مفہومِ ناتمام لیے

گرانے والے تبسم سے بجلیاں دل پر
ملا نہ آنکھ محبت کا یوں پیام لیے

پھرے ہیں بارہا مایوس تیرے در سے ہم
بصد خلوصِ غمِ دل کا احترام لیے

الٰہی خیر کہ ساجد کی دلنوازی کو
وہ اٹھ رہی ہے نظر تیغِ بے نیام لیے

# مطبوعاتِ جدیدہ

**الطبری** (عربی)۔ از ڈاکٹر احمد محمد الحوفی، صفحات ۲۷۸، عربی ٹائپ،
ناشر شعبۂ نشر و اشاعت وزارت ثقافت مصر، قاہرہ۔

امام طبری کی شخصیت ائمۂ اسلام میں ایک خاص امتیاز رکھتی ہے، اسلامی تاریخ میں ان کی جیسی جامع شخصیتیں بہت کم پیدا ہوئی ہیں، وہ ایک بالغ نظر مفسر، دقیقہ رس ادیب و مورخ اور فقہ و حدیث میں آپ اپنی نظیر ہیں، اور ان تمام موضوعات پر ان کی تصانیف موجود ہیں، مگر یہ افسوس کی بات تھی کہ ان کی شخصیت، سوانح حیات اور علم و فضل کے بارے میں اردو کیا عربی میں بھی کوئی مفصل کتاب موجود نہیں تھی، مصر کی وزارتِ ثقافت قابلِ تحسین ہے کہ اس نے اس موضوع پر ایک اچھی کتاب فراہم کر دی۔

کتاب میں دس فصلیں ہیں، جن میں ان کی زندگی اور علم و فضل کے ہر گوشے پر نہایت ہی عالمانہ اور سیر حاصل بحث کی گئی ہے، مصنف کا قلم ہر جگہ متوازن نظر آتا ہے، اور انھوں نے حیات لکھی ہے وہ یا تو مستند تذکروں، تاریخوں کی مدد سے لکھی ہے یا خود امام طبری کی کتابوں سے سند لائے ہیں۔ الطبری کی تالیف سے عربی تذکروں میں ایک عمدہ اور قیمتی اضافہ ہوا ہے۔

**روضۃ الورد** (عربی) از محمد الفراتی، صفحات ۳۰۸، ٹائپ بہترین،
ناشر شعبۂ تالیف و ترجمہ وزارت ثقافت (شام دمشق)



شیخ سعدی کی گلستاں کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ کم کتابوں کو حاصل ہوئی ہوگی، یہ کتاب ایران و افغانستان کے ساتھ ہندوستان میں بھی کئی صدی سے مقبولِ عام ہے، آج سے تیس چالیس برس پہلے تو کوئی آدمی اس وقت تک تعلیم یافتہ نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک کہ سعدی کی گلستاں یا بوستاں یا اس کا انتخاب نہ پڑھ لے، اس کتاب کا ترجمہ دنیا کی تمام قابلِ ذکر زبانوں میں ہو چکا ہے، اس لیے ضرورت تھی کہ عرب دنیا کو بھی حکمت و دانائی کے اس گنجینۂ عجم سے باخبر کیا جائے شام کی وزارت تعلیم و ثقافت قابلِ مبارکباد ہے کہ اس کے شعبۂ تالیف و ترجمہ کے ذریعہ یہ مفید کام انجام پایا۔

کتاب کے مترجم محمد الفراتی کو عربی اور فارسی دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہے، فارسی نثر کا عربی ترجمہ ہی کیا کم مشکل کام تھا، کہ انھوں نے سعدی کے اشعار کا بھی عربی میں ترجمہ کیا ہے اور اس کی شعریت کو کہیں بھی مجروح ہونے نہیں دیا ہے، کتاب کے نام سے بھی ان کی خوش مذاقی کا پتہ چلتا ہے۔

**القادیانی والقادیانیہ** (عربی)۔ از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی،
صفحات ۱۵۲۔ ٹائپ۔ ناشر المجمع الاسلامی العلمی، ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

قادیانیت کی تردید میں ہندوستان کے ہر فکر و خیال کے علماء نے اردو میں بے شمار کتابیں لکھی ہیں، جن کا اثر یہ ہوا کہ ہندوستان و پاکستان میں قادیانیت کا دائرہ بہت زیادہ وسیع نہ ہو سکا، عرب ممالک کے لوگ چونکہ اس فتنہ کی حقیقت سے پوری طرح واقف نہیں ہیں، اس لیے اب تک اس کے دامِ فریب میں آتے جاتے ہیں، ضرورت تھی کہ علمی انداز میں کوئی مفصل چیز عربی زبان میں اس موضوع پر

لکھ دی جائے تاکہ عرب ممالک میں یہ فتنہ نہ پھیل سکے۔ اسی مقصد کے تحت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی نے آج سے کئی سال پہلے یہ کتاب لکھی جس کا یہ دوسرا اڈیشن ہے۔ اس کے اردو ترجمہ پر معارف میں اس سے پہلے تبصرہ ہو چکا ہے کتاب چونکہ بہت مدلل اور سنجیدہ انداز میں لکھی گئی ہے اس لیے عرب ممالک کے ہر طبقہ میں پسند کی گئی۔

**مسئلۂ اجتہاد پر تحقیقی نظر**۔ از مولانا تقی امینی صفحات ۱۶۰، کتابت طباعت بہتر، قیمت ۳؍، پتہ: ادارہ علم و عرفان، اللہ رکھا بلڈنگ اسٹیشن روڈ، اجمیر۔

مولانا تقی امینی صاحب فقہ اور اصولِ فقہ پر مختلف عنوانات کے تحت بہت سے مضامین لکھے ہیں، جو اہل علم میں پسند کیے گئے۔ اب یہی مضامین کتابی شکل میں شائع کیے جا رہے ہیں، اسی سلسلے کی کتاب مسئلہ اجتہاد پر تحقیقی نظر بھی ہے۔ اس میں مسئلۂ اجتہاد کے ہر پہلو پر پُرمغز اور مفید بحث کی گئی ہے، اور جا بجا موجودہ دور کے نئے پیدا شدہ مسائل میں اجتہاد کے طریقوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، خاص طور پر کتاب کا آخری باب "کن صورتوں میں اجتہاد کی ضرورت ہے" کتاب کا حاصل ہے، مگر اسی کے ساتھ مولانا کو ان نئے اور پرانے مسائل کے بارے میں بھی اپنے نتائجِ فکر سے آگاہ کرنا چاہیے تھا، جن کو موجودہ دور کے تجدد پسند مجتہدین نے اپنے اجتہادات کا ہدف بنا رکھا ہے۔ اجتہاد کا مسئلہ اب ایک علمی مسئلہ نہیں رہا، بلکہ وہ اس دور کی ایک عملی ضرورت ہے، جس پر علماء کو انفرادی و اجتماعی طور پر غور کرکے کوئی فیصلہ کرنا ہے بہرحال اس کتاب نے غور و فکر کے لیے اچھا خاصہ مواد فراہم کر دیا ہے۔



**الفخری** (ترجمہ) از مولانا محمد جعفر شاہ صاحب پھلواروی صفحات ۴۰۶، کتابت، طباعت متوسط، قیمت ہم۔ پتہ ادارہ ثقافت اسلامی، لاہور۔

اسلامی تاریخوں میں ابن طقطقی کی کتاب الفخری کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے، اختصار کے باوجود اہم واقعات کی بڑی جامع کھتونی ہے، ساتھ ہی ساتھ اس نے اصول حکومت اور آداب حکومت پر بھی بڑی قیمتی باتیں لکھی ہیں، اس کتاب کی دو خاص خصوصیتیں ہیں، ایک اس کی بے لاگ رائیں، دوسری اس کا اچھوتا ادبی طرز بیان، اس کے زمانہ میں عربی نثر پر حریری اور بدیع الزماں ہمدانی کا رنگ چھایا ہوا تھا، مگر اس نے ان کی تقلید کرنے کے بجائے ادب و انشا میں اپنی ایک نئی راہ نکالی، جس سے عربی نثر کو بڑا فائدہ پہنچا، اس نے خود بھی لکھا ہے کہ لوگ حماسہ اور مقامات حریری اور بدیعی پڑھتے ہیں، میری کتاب ادب سکھانے کے لیے ان تینوں سے زیادہ مفید ہے، شیعہ ہوتے ہوئے اس نے خلافت راشدہ اور خلافت اموی کا تذکرہ بعض مسامحات کو نظر انداز کرتے ہوئے جس منصفانہ انداز میں کیا ہے، اس سے اس کی تاریخی دیانتداری کے ساتھ ساتویں صدی کا اور چودھویں صدی کی شیعیت کی ذہنیت کا فرق بھی معلوم ہوتا ہے، ادارۂ ثقافت نے اس کتاب کا اردو ترجمہ شائع کرکے اردو داں طبقہ کو اسلامی تاریخ کے ایک اچھے ماخذ سے فائدہ اٹھانے کا جو موقع فراہم کیا ہے، اس کے لیے وہ مبارکباد کا مستحق ہے، ترجمہ کی خوبی کے لیے مولانا شاہ محمد جعفر صاحب پھلواروی کا نام ضمانت ہے۔

**تحفۃ الشعراء** (فارسی)۔ از مرزا افضل بیگ خاں قاقشال، مرتبہ ڈاکٹر حفیظ قتیل صاحب ضخامت ۱۰۷ صفحات، کتابت و طباعت معمولی، پتہ: مکتبہ کتاب گھر، ایوان اردو، خیرت آباد، حیدرآباد دکن

تحفۃ الشعراء بارہویں صدی ہجری کے نصف آخر کے ابتدا کی تصنیف ہے، وہ اپنی قدامت کی وجہ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے، اس میں ہندوستان کے ۶۲ شعراء کا ذکر ہے، جن میں بعض فارسی کے شاعر ہیں اور بعض فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے، کتاب کا اختتام مرزا مظہر جان جاناں کے تذکرے پر ہوا ہے، ادارہ ادبیات اردو قابل تحسین ہے کہ اس کے ذریعہ ایک نادر ادبی تحفہ اہل علم تک پہنچ گیا، اس میں شعراء کے بارے میں بعض نئی معلومات اور رائیں ملتی ہیں، جس سے اس کی افادیت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔

**مجموعۂ کلام شفیق جونپوری** } مرتبہ عزیز ربانی عزیز، صفحات ۱۴۴، کتابت وطباعت معمولی، قیمت ۶ روپیہ: اڈیٹر ہفتہ وار اردو دنیا، جونپور

شفیق جونپوری مرحوم ہندوستان کے ان ممتاز شعراء میں تھے جو اپنا ایک اچھوتا رنگ رکھتے تھے، مذہبیت کے ساتھ شاعرانہ ذوق ...... ان کو اپنے والد انیق جونپوری سے ورثہ میں ملا تھا، ان کی غزلیں اور نظمیں دونوں پُرحکمت و پُرکیف ہوتی ہیں، مگر ان کا اصل رنگ غزل میں نمایاں ہوتا ہے، ان کی غزلیں تغزل کی لفظی و معنوی خوبیوں کے ساتھ درد وسوز اور حکیمانہ خیالات واحساسات سے بھی پر ہوتی ہیں، اس سے پہلے ان کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، اس مجموعہ میں انکی زندگی کے آخری حصہ کے کلام کو عزیز ربانی نے جمع کر دیا ہے۔

"م - ج"

جلد ۹۲ - ماہ ربیع الاول ۱۳۸۳ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۶۳ء عدد ۲

## مضامین